Title - HAYAAT-E-SAADI

Creator - Khwaja Altaf Hussain Hali.

Publisher - Majlis Taraqqi Adab (Lahore).

Date - 1960

Pages - 243.

Subject - Saadi Sheerazi - Sawaneh-o-Tanqeed; Tazkira Shoarae Farsi - Saadi Sheerazi.
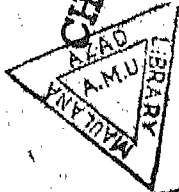
پیش لفظ

(از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

حیات سعدی کا پہلا اڈیشن ۸/۲۶ × ۲۰ کی تقطیع پر [illegible] ہجری

طابق ۱۳۰۳ ہجری میں شائع ہوا تھا۔کتاب مطبع انصاری [illegible] چھپی
ہی اور اس کے ۲۲۰ صفحات تھے ، فی صفحہ ۱۹ سطریں [illegible] کاغذ
معمولی تھا اور لکھائی چھپائی بھی کچھ بہتر نہ تھی ، کتابت کی غلطیاں
ہی کتاب میں رہ گئی تھیں جن کے لیے مولانا کو آخر میں غلط نامہ
گانا پڑا تھا - چونکہ اردو میں اپنی طرز کی یہ پہلی سوانح عمری تھی
ں لیے ہاتھوں ہاتھ نکل گئی اور ایک ہی سال بعد ۱۸۸۷ء میں اس کا
وسرا اڈیشن مولانا نے ۸/۲۲ × ۱۸ کی تقطیع پر شائع کیا - تیسرا
یشن اسی تقطیع پر ۱۸۸۸ء میں مجتبائی پریس لاہور سے چھپوا کر دھلی
ے شائع کیا - بس کل تین مرتبہ یہ کتاب مولانا نے خود شائع کی ہے -
گرچہ کتاب بہت اچھی فروخت ہو رہی تھی مگر مولانا نے نہایت ایثار
ے کام لے کر اسے مدرسۃالعلوم علی گڑھ کو دے دیا تاکہ اس کی
وخت سے مدرسۃالعلوم کو کچھ پیسے مل جائیں - مگر بکڈپو
درسۃالعلوم کے کارکنوں نے اس پر منفعت کتاب کو ڈالے رکھا اور
ں کا کوئی ایڈیشن شائع نہ کیا - جب ہر طرف سے کتاب کی مانگ
ونے لگی تو آٹھ برس کے بعد سنہ ۱۸۹۶ء میں اس کا چوتھا ایڈیشن
۸/۲۶ × ۲ کی تقطیع پر علی گڑھ سے شائع کیا ، مگر نہایت خراب اور
ی کاغذ پر ، بری لکھائی چھپائی کے ساتھ - جب کتاب کی مانگ ملک
ں بہت زیادہ ہوئی تو مختلف مقامات کے تاجران کتب نے دھڑا دھڑ
لانا سے بغیر پوچھے اس کے اڈیشن نہایت غلط سلط چھاپ کر روپے کمانے
روع کیے مگر مولانا نے اپنے اخلاق اور مروت کے باعث کسی کو
ع نہ کیا اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا - لیکن یہ بازاری اڈیشن

بالعموم نہایت غلط چھپتے رہے - اشد ضرورت تھی کہ پہلے اڈیشن کے مطابق اس اعلیٰ درجے کی ادبی اور تنقیدی کتاب کا نیا اڈیشن نہایت صحت و صفائی کے ساتھ شائقین ادب کے مطالعے کے لیے بڑے اہتمام اور احتیاط سے شائع کیا جائے -"

میرے پاس اس کتاب کے دوسرے ، تیسرے اور چوتھے اڈیشن کی ایک ایک کاپی تو موجود تھی مگر پہلا اڈیشن نہ تھا جس کی میں سنہ ۱۹۱۴ء سے تلاش کر رہا تھا - خود مولانا حالی کے ذاتی کتب خانہ میں بھی (جس کا میں انچارج تھا) اس کتاب کے پہلے اڈیشن کا کوئی نسخہ نہ تھا - میں اس نایاب اڈیشن کی تلاش چوالیس سال تک مسلسل کرتا رہا - آخرکار اپریل سنہ ۱۹۵۸ء میں بالکل غیر متوقع طور پر میرے نہایت ہی محترم دوست حضرت فاضل زیدی نے نواب شاہ (سندھ) سے یہ اڈیشن مجھے بھیج دیا - اس عنایت اور مہربانی کے لیے میں جس قدر بھی ان کا شکریہ ادا کروں کم ہے -

محترمی جناب سید امتیاز علی تاج ڈائرکٹر مجلس ترقی ادب لاہور آج کل بعض خاص خاص نایاب اور مفید قدیم کتابوں کے جدید اڈیشن مجلس کی طرف سے شائع کر رہے ہیں (جو بڑا ہی مستحسن کام اور ادب اردو کی نہایت ٹھوس خدمت ہے)- جب انھیں معلوم ہوا کہ حیات سعدی کا پہلا اڈیشن میرے پاس ہے تو انھوں نے اسے نہایت حسن و خوبی اور نفاست کے ساتھ بجنسہ دوبارہ چھاپنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تاکہ وہ اہل علم اصحاب کی لائبریریوں کی زینت بن سکے - الحمدللہ آج ناظرین کرام سید صاحب محترم کے ارادے کو عملی شکل میں ملاحظہ فرما رہے ہیں -

میں حیات سعدی کے اس اولین اڈیشن کی نقل نہایت احتیاط کے ساتھ صاحب ذوق حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں - اس کی نقل کرتے ہوئے میرے سامنے حیات سعدی کے مختلف اڈیشن تھے - جہاں جہاں مجھے شبہ ہوا ہے، وہاں میں نے دوسرے نسخوں کو دیکھ کر الفاظ اور عبارت کو نہایت صحیح لکھنے کی کوشش کی ہے - جہاں جہاں پہلے اڈیشن اور بعد کے نسخوں میں اختلاف تھا اسے واضح طور پر بیان کردیا ہے - جہاں جہاں کتابت یا سہو کی غلطیاں تھیں ان کی موقع پر نشان دہی کر دی ہے - جہاں جہاں پہلے اڈیشن میں بعد والے نسخوں سے کوئی

بارت یا بیان زیادہ تھا اس کو علیحدہ بتا دیا ہے (تمام کتاب میں ایسے
انات چھ جگہ آئے ہیں)- پہلے اڈیشن کے سر ورق پر مولانا نے اس وقت
ے رواج کے مطابق کتاب کے متعلق طویل عبارت تحریر فرمائی ہے ، میں
نے اسے تبرک کے طور پر اسی طرح رہنے دیا ہے - کتاب کا جو غلط نامہ
ولانا نے اس پہلے اڈیشن کے آخر میں چھاپا تھا (اور اس عہد میں یہ
م دستور تھا) میں نے اس کے مطابق کتاب کو درست کر دیا ہے -
تاب کے آخر میں اپنی کتابوں کا جو اشتہار مولانا نے اپنے نام اور اپنے پتے
ے دیا تھا ، میں نے اس خیال سے اسے بھی شامل کتاب کر دیا ہے کہ
ک تو یہ نسخہ اولین ایڈیشن کی مکمل نقل ہو ، دوسرے ناظرین کو
ں کا بھی علم ہو جائے کہ مولانا نے اس وقت تک کون کون سی
تابیں تصنیف فرمائی تھیں اور ان کی اس وقت کیا کیا قیمتیں تھیں ؟
ز یہ کہ مولانا اپنے قیام دھلی میں کس جگہ رہتے تھے ؟ اس کتاب
، پروف ریڈنگ بھی بڑی احتیاط سے کی گئی ہے تاکہ نقل اصل کے عین
طابق ہو - جہاں جہاں مولانا نے الفاظ اس وقت کے رسم الخط کے
طابق لکھے تھے ، میں نے اس اڈیشن میں ان کو عبارت میں ایک لفظ
کمی بیشی کیے بغیر موجودہ رسم الخط میں لکھا ہے ، تاکہ ناظرین
تاب کو آسانی اور سہولت سے پڑھ سکیں - غرض میں نے پوری کوشش
ں امر کی کی ہے کہ اس اڈیشن کو بہتر سے بہتر صورت میں مرتب کروں -
دا کرے میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں -

خاکسار - محمد اسماعیل پانی پتی
رام گلی نمبر ۳ - لاھور

مورخہ ۲۶ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

قدر اسرار دل نہ سمجھے معلوم نہ تھا۔

حالات مؤلف

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں بمقام پانی پت ضلع کرنال پیدا ہوئے ۔ ان کے مورث اعلیٰ خواجہ ملک علی صاحب ہرات سے وارد ہند ہوئے تھے ۔ شاہی دربار میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور حسن خدمات کے صلے میں پانی پت اور اس کا ملحقہ علاقہ خواجہ ملک علی صاحب کو بصیغۂ مدد معاش دیا گیا ۔ آپ اس علاقے کے منصب قضاء پر بھی فائز ہوئے ۔

مولانا حالی اجداد کی جانب سے انصاری تھے لیکن والدہ ماجدہ سادات سے تھیں ۔ خواجہ الطاف حسین کی کم سنی میں ہی ان کے والد انتقال فرما گئے ۔ اس کے کچھ زمانے کے بعد جب کہ آپ کی عمر صرف نو سال کی ہی تھی، آپ کی والدہ نے بھی رحلت اختیار فرمائی ۔ پانی پت میں رہ کر آپ نے فارسی تعلیم سید جعفر علی صاحب سے اور عربی مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے حاصل کی ۔ ۱۷ سال کی عمر میں آپ کا عقد نکاح ایک دولت مند گھرانے میں ہو گیا ، لیکن یہ بندھن آپ کو تحصیل علم کے لیے مانع نہ آیا اور آپ کو اکتساب علم کا شوق کشاں کشاں دھلی لے پہنچا ، جہاں ۱۸۵۵ء تک علوم منطق و فلسفہ اور عربی کی سند فضیلت حاصل کی ۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں آپ ایک قلیل مشاہرے پر ملازم ہو گئے لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا ۔ ۱۸۶۳ء میں مولانا حالی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی خدمت میں پہنچ گئے جہاں ان کی وفات تک ۷ سال کا زمانہ گزارا ۔ اس کے

بعد آپ گورنمنٹ پنجاب کے لاہور بکڈپو میں ملازم ہو گئے، جہاں چھپنے والی کتابوں کی اصلاحِ زبان کا کام آپ کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد ان کا تقرر اینگلو عربک اسکول دھلی میں ہو گیا اور آپ لاہور سے دھلی پہنچ گئے۔

نواب سر آسمان جاہ مدارالمہام سلطنت آصفیہ علی گڑھ پہنچے تو سر سید احمد خاں نے مولانا حالی کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب صاحب نے مولانا حالی کے لیے ۷۵ روپے ماھوار علمی وظیفہ مقرر کر کے ان کو فکر معاش سے آزاد کر دیا۔ ۱۳۰۹ھ میں جب علی گڑھ ڈپوٹیشن حیدر آباد پہنچا تو حالی اس کے ایک رکن تھے۔ اس مرتبہ اعلیٰ حضرت نے مولانا کا وظیفہ ۷۵ روپے سے ۱۰۰ روپے ماھوار کر دیا۔ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر مولانا حالی نے اپنی توجہ تصنیف و تالیف کی جانب مبذول فرمائی۔

۱۸۷۴ء میں کرنل ھال رائڈ ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم پنجاب نے لاھور میں جدید اردو شاعری کے سلسلے میں مشاعروں کی بنا ڈالی۔ اس تحریک کے سرگرم رکن مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ حالی کو اپنے جذبۂ فطری کی مشق کا موقع مل گیا، چنانچہ ان کی چار مشہور نظمیں (۱) برکھا رت (۲) نشاط امید (۳) مناظرۂ رحم و انصاف اور (۴) حب وطن، انھیں مشاعروں کی یادگار ھیں۔ لاھور سے دھلی پہنچ کر بھی مولانا حالی اسی طرح نئی طرز کی نظمیں لکھتے رہے اور پھر بالآخر سر سید احمد خاں کی تحریک پر ۱۸۷۹ء میں اپنا مشہور قومی مسدس تصنیف فرمایا۔ مولانا حالی نے اس مسدسِ مد و جذر اسلام کے بعد کوئی عاشقانہ غزل نہیں کہی۔ مولانا نے اس نظم کے بعد متعدد نیچرل اور اصلاحی نظمیں، مثلاً آزادی کی قدر، قحط اھل اللہ، بے تمیزیٔ ابنائے زماں، نیشن کی تعریف، استفادہ، اسراف وغیرہ لکھیں۔

نظموں کے علاوہ مولانا حالی نے رباعیات میں بھی جودتِ طبع

کا مظاہرہ فرمایا ۔ ان کی رباعیات کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو
سیاب اکبر آبادی رباعیات حالی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں
"ہم رباعیوں کے متعلق صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ فار
میں عمرخیام کی رباعیات نے جو شہرت حاصل کی وہ شاید مولانا
کی رباعیوں کے مرتبے کو نہ پہنچ سکی ۔ رباعیات حالی کا تر
عمر خیام کی رباعیوں کی طرح انگریزی میں بھی کئی مرتبہ ہو
لیکن درجہ امتیاز جو ان رباعیوں کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ
قوم کا بچہ بچہ ان سے فیض اور حظ اٹھا رہا ہے ۔گھروں میں لڑ
پڑھ کر ان سے اپنے اخلاق کو سنوار رہی ہیں اور سکولوں
طلباء ان سے سبق عبرت لے رہے ہیں ۔ رباعیوں میں برجستگی
ایجاز و اختصار کی بہت ضرورت ہوا کرتی ہے ، وہ سب مولا
رباعیوں میں موجود ہیں"۔

مولانا حالی کی اکثر نظمیں ان کی حیات ہی میں شائع ہو
اور ان کے بعد لاتعداد مرتبہ شائع ہو چکی ہیں ۔ آپ کا
کسی کے حق میں محفوظ نہیں تھا ۔ جس مطبع نے چاہا چھاپا
جو مطبع چاہتا ہے چھاپ لیتا ہے ۔

مولانا حالی جدید اردو شاعری ہی کے علمبردار نہیں
بلکہ جدید اردو نثر کے بھی بے مثل ادیب تھے ۔ آپ نے ۲۰
کی عمر میں بزبان عربی ایک رسالہ نواب صدیق حسن خان بہاد
تائید میں تحریر فرمایا تھا جو شائع نہیں ہو سکا ۔

حالی کی تصانیف نثر :-

(۱) تریاق مسموم ۔ پادری عمادالدین کی کتاب ہدایت المسـ
کے رد میں ۔ مطبوعہ ۱۸۶۷ء مطابق ۱۲۸۴ھ ۔

(۲) طباق الارض ۔ عربی سے ترجمہ ۔ مطبوعہ ۱۸۶۸ء ۔

(۳) اصول فارسی ۔ مطبوعہ ۱۸۶۸ء ۔

(۴) مولود شریف ۔ تصنیف قبل ۱۸۷۰ء مطبوعہ ۱۹۳۲ء ۔

(۵) تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے۔ مطبوعہ ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ ۔

(۶) شواہد الالہام ۔

(۷) مجالس النساء (دو حصے) ۔ مطبوعہ ۱۸۷۴ء ۔

(۸) سوانح عمری حکیم ناصر خسرو علوی ۔ ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ھ ۔

(۹) حیات سعدی ۔ مطبوعہ ۱۸۸۶ء ۔

(۱۰) مقدمۂ دیوانِ حالی ۔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء ۔

(۱۱) یادگارِ غالب ۔ مطبوعہ ۱۸۹۶ء ۔

(۱۲) حیات جاوید ۔ مطبوعہ ۱۹۰۱ء ۔

(۱۳) سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن محدث پانی پتی ۔

(۱۴) مضامینِ حالی ۔

(۱۵) مقالاتِ حالی ۔

(۱۶) مکتوباتِ حالی ۔

حالی کی تصانیف نظم :-

(۱) برکھا رت (۱۸۷۴ء) ۔

(۲) نشاط امید (۱۸۷۴ء) ۔

(۳) رحم و انصاف (۱۸۷۵ء) ۔

(۴) حبِ وطن (۱۸۷۵ء) ۔

(۵) مسدّس مدّ و جزر اسلام (۱۸۷۹ء) ۔

(۶) شکوۂ ہند (۱۸۸۶ء) ۔

(۷) مناجات بیوہ (۱۸۸۷ء) -
(۸) دیوان حالی (۱۸۹۳ء) -
(۹) چپ کی داد (۱۹۰۵ء) -
(۱۰) رباعیات حالی (اشاعت ۱۹۱۸ء) -

مولانا حالی کے والدین شیعہ تھے لیکن مرحوم نے اہل سنت و الجماعت کا مسلک اختیار فرمایا - ان کی اولاد اور خاندان میں ابھی تک دونوں عقاید کے اصحاب پائے جاتے ہیں - مولانا حالی ایک صلح کل اورغیر متعصب شخص تھے - ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آپ نے انتقال فرمایا -

حیات سعدی

مولانا حالی اردو زبان میں سوانح نگاری کے امام ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب سوانح نگاری کی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں : ''یہاں اتنے عظیم الشان کام کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی عزت صرف حالی کے حصے میں آئی - یہی وجہ ہے کہ ہم اردو میں فن سوانح نگاری کی امامت کا مستحق بھی انھیں کو سمجھتے ہیں - عام طور پر تاریخ ادب کے مصنفین نے اردو میں بیا گرافی لکھنے والوں کی تعداد دو حضرات تک ہی محدود رکھی ہے، یعنی مولانا حالی اور مولانا شبلی، لیکن ایک حیثیت سے ہم اس تعداد کو بڑھا کر چار تک لے جا سکتے ہیں - یعنی ان کے ساتھ شرر اور مولوی چراغ علی کے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں اگرچہ صحیح معنوں میں مولانا حالی ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنا اکثر وقت اور اپنی اکثر توجہ سوانح نگاری کی طرف مبذول کی ''۔

(مولانا حالی کی کتب سوانح مشمولہ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۷ء) -

مولانا حالی نے تین سوانح عمریاں لکھی ھیں :-

(۱) حیاتِ سعدی (۲) یادگارِ غالب (۳) حیاتِ جاوید۔
حیاتِ سعدی کی تصنیف سے ۱۸۸۵ء میں فراغت پائی اور اس کی اشاعت اول ۱۸۸۶ء میں ھوئی۔

مولانا حالی نے جس وقت حیاتِ سعدی تصنیف فرمائی ، اس وقت تک سعدی کے حالات مرتب نہیں ھوئے تھے۔ مولانا حالی کے پیشِ نظر صرف شعراء کے تذکرے اور کلیات سعدی کا دیباچه تھا۔ انھیں سامنے رکھ کر حالی نے اتنی عظیم‌الشان کتاب تصنیف کر ڈالی که مولانا شبلی نے جب شعرالعجم میں سعدی کا عنوان قائم کیا تو لکھا :—

"مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائده ھے لیکن بعض تعلیم یافته دوستوں نے حد سے زیاده اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا"۔ (شعرالعجم حصه دوم)

حیاتِ سعدی کے مآخذ :—

(۱) شعراء کے تذکرے۔ خاص طور پر سرگورا وسلی کا تذکره۔

(۲) معاصرانه تاریخیں۔

(۳) کلیات شیخ سعدی، مخطوطه، مخزونه کتاب خانهٔ دیوانِ هند لندن (۱۱۱۷) سن کتابت ۷۲۸ھ ، یعنی شیخ سعدی کی وفات (۶۹۱ھ) کے ۳۶ سال بعد ، ابوبکر بن علی بن احمد نے شیخ کے اصل نسخے سے نقل کیا۔ چنانچه وه ترقیمے میں لکھتے ھیں : "منقول من خط الشیخ العارف السعدی" اس کلیات کے مقدمے میں علی ابن احمد نے شیخ کے کچھ حالات اور تصانیف کے متعلق لکھا ھے۔

مولانا حالی کی کتاب دو باب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ پہلا باب سوانح حیات پر اور دوسرا تصانیف کی تفاصیل و تبصرے کے لیے وقف ہے۔ خاتمے میں عام حالات اور شاعری پر بالا جمال نظر ڈالی گئی ہے۔

حیاتِ سعدی میں مندرج کچھ معلومات اگرچہ بعد کی تحقیقات کی رُو سے کسی حد تک ساقط الاعتبار ہو گئی ہیں (دیکھیے سعدی نامہ از حبیب یغمائی مطبوعہ تہران) ۔ لیکن جس وقت حالی نے یہ کتاب لکھی تھی تو ارباب فضل و کمال کے سامنے بہت ھی تھوڑا مواد منتشر صورت میں تھا ۔ اس کے بعد سعدی کے حالات کی جانب توجہ کی گئی اور تحقیقات کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ۔ لیکن اس لحاظ سے شرفِ تقدّم مولانا حالی کو ھی حاصل رہے گا کہ ان کی یہ کتاب سعدی کے حالات پر اولین کارنامہ ہے جو اھل علم کے سامنے آیا ۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بر صغیر پاک و ھند کے مختلف مطابع نے اس کے لا تعداد ایڈیشن شائع کیے اور زمانۂ تصنیف سے آج تک یہ کتاب مختلف نصابوں میں شامل رھی ہے ۔ اس کا فارسی ترجمہ بھی سررش نے کیا جو تہران سے مکتبہ دانش نے ۱۳۱۶ء میں شائع کیا ۔

الغرض مولانا حالی کے مخصوص اسلوبِ نگارش، وقیع معلومات اور سعدی پر اولین تحقیقی کارنامے کے اعتبار سے یہ کتاب اردو ادب کا وہ جوھرگراں‌مایہ ہے جس کی تابناکی میں مرورِ زمانے کے ساتھ ساتھ اضافہ ھی ھوتا چلا جائے گا ۔

کارپردازان مجلس ترقیٔ ادب لاھور

فہرست

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً وَ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْراً

حیات سعدی

یعنی شیخ سعدی شیرازی رحمة اللہ علیہ کی سوانح عمری اور اُن کی تمام نظم و نثر پر جُدا جُدا ریویو، جس میں شیخ کی ابتدائے عمر سے وفات تک کا حال جس قدر معلوم ہو سکتا تھا ترتیب وار لکھا گیا ہے اور اُن کے کلام کی اصلی خوبیاں واضح طور پر جتائی گئی ہیں اور اُس کا مقابلہ ایران کے بعض نامور شعراء کے کلام سے کیا گیا ہے اور جو فرق شیخ اور دیگر شعرا کی شاعری میں ہے اُس کو جہاں تک ممکن تھا نہایت روشن بیان میں ظاہر کیا گیا ہے -

مُرتّبۂ خاکسار الطاف حسین پانی پتی مقیم دہلی متخلّص بہ حالی

۱۸۸۶ ء

مطبع انصاری واقع دہلی میں چھپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

مشہور آدمیوں کا حال لکھنا جس کو یونانی میں بیوگریفی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں کم و بیش قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ اس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کئے جاتے تھے، لیکن یہودیوں کے ہاں قدما کی سرگزشتیں لکھی بھی جاتی تھیں۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگریفر پلوٹارک کی بیوگریفی جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی، اس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے اور عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں اس زمانے کے اولیاء، شہداء اور مجتہدوں کی سوانح عمریاں جو کسی قدر مکمل ہیں کثرت سے موجود ہیں۔ زمانۂ متوسط میں مسلمانوں کی بیوگریفی سب سے زیادہ وقعت کے قابل ہے، لیکن ان دونوں زمانوں میں تذکرہ لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے، درایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغے کو زیادہ کام میں لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بیوگریفی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی ہے۔ صرف رجال حدیث کے حالات جو محدّثین نے لکھے ہیں ان میں البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے۔ ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم و کاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ

بیان کی گئی ہیں۔ باقی علماء اور شعراء وغیرہ کے تذکرے
ایسے نہیں ہیں اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور
روایت پر تھا، اس لیے ان لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ
میں مفصّل لکھے گئے ہیں (جیسے خلفا، سلاطین، وزرا اور
سپہ سالار وغیرہ) باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر
تحریر ہوئے ہیں اور مشہور سے مشہور مصنّف کی لائف جدا گانہ
نہیں لکھی گئی۔ زمانۂ حال میں یورپ کے مؤرخوں نے، خاص
کر سترھویں صدی سے بیوگریفی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں
تک کہ تاریخ کی طرح بیوگریفی نے بھی فلسفے کی شکل اختیار کی
ہے۔ حال کی بیوگریفی میں اکثر مؤرخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور
واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنّف
کے کلام میں خوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں
صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص
کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔

بیوگریفی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں
نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی
ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ
کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ خصوصاً جو قومیں علمی ترقیات
کے بعد پستی اور تنزّل کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لیے
بیوگریفی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا
ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے
کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں
آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل
کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر
لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی
کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت

کے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا تھا ۔ چنانچہ لکھا ہے کہ لوتھر[1] کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن فرینکلن[2] نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ کی ترقی اور شہرت حاصل کی ، اس کا بڑا سبب یہی بیوگریفی کا مطالعہ تھا ۔ بیوگریفی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سود مند ہے ۔ کیوں کہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگریفی سے اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے ۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ''بیوگریفی چلّا چلّا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو''۔ ہمارے ملک میں بیوگریفی کی طرف اب تک کچھ توجہ نہیں ہوئی ۔ ملک کی عام زبان یعنی اردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں ، یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں جن کے حالات پڑھ کر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی ۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور ان کے کمالات قوم کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ ان کا نام زندہ کرنے اور آئندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے ان کے فضائل اور کمالات دنیا میں شائع کریں ، مگر مشکل یہ ہے کہ

---

۱ - لوتھر جرمنی کا رہنے والا عیسائی مذہب کا ایک مشہور مصلح اور تمام یورپ کو پوپ کے پنجے سے نجات دینے والا ہے ۔ ۱۴۸۳ء میں پیدا ہوا ۱۵۴۶ء میں فوت ہوا ۔

۲ - یہ شخص امریکہ کا ایک مشہور فاضل ہے جس نے سب سے اول علم برق کے اصول دریافت کیے ہیں ۔ ۱۷۰۶ء میں بمقام بوسٹن پیدا ہوا اور ۱۷۹۰ء میں فوت ہوا ۔

قدماء میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں ان کے بھی مفصّل حالات دستیاب ہونے سخت دشوار بلکہ ناممکن ہیں - صرف تذکروں میں کچھ کچھ مختصر حال درج ہے ، لیکن اس سے کسی کی لائف ترتیب وار لکھنی ہرگز ممکن نہیں -

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے ، شاید ان کے مفصّل حالات بہم پہنچ جائیں ، ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں دیکھے اور ایک انگریزی تذکرہ سر گورا[1] وسلی صاحب کا بھی دیکھا ، مگر ان تمام تذکروں میں زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکایتیں جو زبان زد خاص و عام ہیں ، تھوڑے تھوڑے تفاوت کے ساتھ مندرج پائیں - شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں - اگرچہ یہ تمام باتیں مایوس کرنے والی تھیں مگر ہم نے اپنے ارادہ کو جس طرح ہو سکا پورا کیا - جس قدر صحیح اور معقول باتیں تذکروں سے معلوم ہو سکتی تھیں ، ان کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کیے اور نیز اس عہد کی تاریخ کے اکثر واقعات کا سراغ لگایا اور کچھ

---

۱ - یہ صاحب ۱۷۸۷ء[1] میں جب کہ مارکوئس ولزلی صاحب گورنر جنرل تھے ، بطریق سیاحت ہندوستان میں آئے تھے - شدہ شدہ لکھنئو میں نواب سعادت علی خاں کے ہاں نوکر ہو گئے - پھر گورنمنٹ کی طرف سے ایران میں سفیر مقرر ہو گئے - سفارت کے زمانے میں ایک تذکرہ ایران کے مشہور شاعروں کا جن میں شیخ بھی شامل ہے ، انھوں نے بہت کوشش سے لکھا تھا -

---

۱ - معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے - لارڈ ولزلی ۱۷۹۸ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور سعادت علی خاں ۱۷۹۷ء میں تخت نشین ہوئے تھے - (محمد اسماعیل پانی پتی) -

باتیں علی بن احمد جامع کلّیات شیخ کے دیباچہ سے اخذ کیں اور کچھ کچھ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی اور ان تمام معلومات کو جہاں تک ممکن تھا ، لائف کی صورت میں مرتب کیا اور شیخ کی تصنیفات کے بیان میں زیادہ تر اپنی ناچیز رائے اور تفحّص پر بھروسا کر کے یہ مضمون ختم کیا گیا ۔ اگرچہ شیخ کی اصل سرگزشت میں جس قدر کہ وہ اب تک معلوم ہوئی ہے کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے ، لیکن جس ترتیب کے ساتھ اس کے پراگندا حال جمع کر کے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں اور جس طریقے سے اس کی عمدہ تصنیفات اور پاکیزہ خیالات پر بحث کی گئی ہے اس سے امید کی جاتی ہے کہ عام ناظرین کے لیے اس کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور خاص کر شعراء کو اس سے کسی قدر بصیرت اور نصیحت بھی حاصل ہوگی ۔

اس کتاب کے دو باب اور ایک خاتمہ ہے ۔ پہلے باب میں شیخ کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں اس کی تصنیفات کا مفصّل ذکر ہے اور خاتمہ میں اس کے عام حالات اور شاعری پر بالا جمال نظر کی گئی ہے ۔ اگرچہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعراء میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے رتبہ کو نہیں پہنچا ۔ لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنفوں کی سوانح عمریاں اور ان کی تصنیفات کا بیان جدا جدا لکھیں گے ۔

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ

اعتزار[1]

شیخ جس طرح طبقۂ شعراء و مصنّفین میں ممتاز سمجھا گیا ہے اسی طرح مشائخ و عرفاء کی مجلس میں اس کو احترام کے ساتھ جگہ دی گئی ہے ، لیکن چونکہ ہم کمالات باطنی کے دیکھنے اور پرکھنے کی آنکھ نہیں رکھتے اس لیے اس کتاب میں صرف بحیثیت شاعری اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھا گیا کہ دوسری حیثیت سے اس کے باب میں قدر ضرورت سے زیادہ چون و چرا کی جائے ۔

دوسرے ہماری زبان میں جیسا کہ ظاہر ہے کسی کو صیغۂ جمع کے ساتھ ذکر کرنا عموماً اس کی تعظیم کی علامت سمجھی جاتی ہے اور صیغۂ مفرد کا استعمال خلاف تعظیم خیال کیا جاتا ہے ، مگر میں نے اس مضمون میں باجودیکہ شیخ کی عظمت مجھ سے بڑھ کر بہت کم لوگوں کے دل میں ہوگی ، اس کو برابر فعل مفرد اور ضمیر مفرد کے ساتھ یاد کیا ہے ، کیوں کہ میری رائے یہ ہے کہ جو شخص کسی کتاب کا موضوع یا ہیرو ہو اس کو خاص خاص حالتوں کے سوا ہمیشہ صیغۂ مفرد کے ساتھ ذکر کرنا ہی اس کی بڑی تعظیم ہے - پس اس عنوان کو جو میں نے اختیار کیا ہے ، ترک تعظیم پر نہیں بلکہ فرط تعظیم پر محمول کرنا چاہیے ۔

---

۱ - 'اعتزار' کے عنوان سے جو عبارت مولانا نے پہلے ایڈیشن میں لکھی ہے وہ بعد کے کسی ایڈیشن میں نہیں پائی جاتی- (محمد اسماعیل پانی پتی)

پہلا باب

شیخ کی سوانح عمری

شیخ کی سرگزشت بیان کرنے سے پہلے اس مردم خیز خطّے کا مختصر حال لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا جس کی خاک سے ایسا مفید اور مقبول مصنف پیدا ہوا اور جہاں سے علما و شعرا اور جلیل القدر مصنفوں کی ایک جماعت کثیر عروج اسلام کے ہر طبقے اور ہر صدی میں ظہور کرتی رہی ہے -

فارس اور شیراز کا حال

ایران کے جنوب مغربی حصّے میں خلیج فارس کے کنارے پر پارس[1] ایک خطّہ ہے جس کو عرب فارس کہتے ہیں، قدیم زمانے میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے لیکن اب خاص اس حصے کو پارس کہا جاتا ہے - اس چھوٹی سی ولایت میں بہت سی قدرتی اور

---

۱ - پارس جیسا کہ فرہنگ ناصری میں لکھا ہے، ہوشنگ کے بیٹے کا نام تھا - اسی کے نام سے قدیم زمانے میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے اور اہل یورپ اب بھی تمام ایران کو اسی لیے پرشیا یعنی پارس کہتے ہیں، لیکن جب سے کہ ایران کے ہر ایک صوبے اور ولایت کا جدا جدا نام رکھا گیا، اس وقت سے پارس اس خاص ولایت کو کہنے لگے -

قدیم مصنوعی چیزیں ایسی ہیں کہ اس کو دنیا کا نمونہ کہا جا سکتا ہے ۔ تقریباً آدھا ملک پہاڑی اور آدھا میدانی ہے اور جنوبی حد پر سمندر یعنی خلیج فارس ہے ۔ آب و ہوا کہیں نہایت گرم ہے اور کہیں نہایت سرد ہے ۔ اکثر صحرا سرسبز و شاداب ہیں ۔ جا بجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں ۔ صحرائے شاپور میں جو کہ شیراز کے نواح میں ہے ایک وسیع قطعہ ہے ، جس کا نام شعب بوّان ہے ۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چار تفریح گاہیں ایسی ہیں جن کا کہیں نظیر نہیں ۔ صُغد سمرقند[1]، غوطۂ دمشق ، نہر ابلہ اور شعب بوّان ۔ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جس کے عہد حکومت میں شیخ نے گلستاں لکھی ہے ، ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہیں ۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہ شعب بوّان ۔ اکثر شعرائے عرب نے اس قطعے کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں ۔ جن میں سے اسلامی شاعر کا قصیدہ جو عضدالدّولہ دیلمی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے ۔ ایک اور شاعر کہتا ہے :

إِذَا أَشْرَفَ الْمَحْزُوْنُ مِنْ رَأْسِ قَلْعَةٍ
عَلَىٰ شِعْبِ بَوَّانَ اسْتَرَاحَ مِنَ الْكَرْبِ

---

۱ ۔ صغد معرب مفرد نشیب کی زمین اور صغد سمرقند ایک نزہت گاہ سمرقند کے قریب تھی ۔ غوطہ بھی نشیب کی زمین کو کہتے ہیں اور غوطۂ دمشق ایک سیر گاہ دمشق میں تھی ۔ اُبلہ بصرہ میں ایک پر فضا مقام تھا وہاں ایک ندی تھی ، اس کو نہر اُبلہ کہتے تھے ۔ یہ تینوں مقام اور شعب بوان دنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے ۔

ترجمہ ۔ جب غمگین آدمی قلعے پر سے شعب بوّان کی فضا کو دیکھتا ہے تو اس کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں ۔

فارس کے میوے عراق عجم میں جاتے ہیں ۔ گرم پانی کے چشمے اور سفید کانیں فارس میں موجود ہیں ۔ فارس کے آثار قدیمہ دنیا کے ان عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانے کے لوگ جن اور پری کے کام سمجھتے تھے ۔ جیسے تخت جمشید، نقش شاپور، دخمۂ فریدوں اور خانۂ زردشت ۔ ان کا مفصّل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے ۔ انھیں آثار قدیمہ کی نسبت عرفی شیرازی نے کہا ہے :

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدیدست صنادید عجم را

اس کے سوا بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں ۔ جیسے یزد، میبذ، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ ۔ ان شہروں میں کثرت سے علما و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں، جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں ۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایہ تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قُم کو دارالمومنین اور یزد کو دارالعبّاد کا خطاب دیا ہے، اسی طرح شیراز کو دارالعلم کے لقب سے ملقّب کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم و فضل زمانے کے انقلاب اور سلطنت اسلامیہ کے تنزل سے اب نہایت پست حالت میں ہے، لیکن اس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم بزرگی اور برتری کے نشّے میں اب تک بدمست ہیں ۔ حاجی لطف علی خاں آذر نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ”شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ ہیں ۔ کسب معاش اس قدر

کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں ۔ تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں اور ہمیشہ سیرگاہوں اور قہوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں "۔

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانے میں پڑی ہے ۔ محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں میں سب سے اول ہندوستان پر لشکر کشی کی ہے شیراز کا بانی ہے۔ یہ شہر پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ایک نہایت ہی سرسبز و شاداب قطعۂ زمین پر آباد کیا گیا ہے ۔ تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ " شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے ۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو "۔ پھر صفّاریوں[1] اور ویلمیوں[2] کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضدالدولہ ویلمی کے زمانے میں اس کی آبادی اس درجے کو پہنچ گئی کہ شہر میں اہل لشکر کی گنجائش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام سوق الامیر رکھا گیا اور اس کے بیٹے صمصام الدّولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پختہ فصیل کھنچوائی ۔

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد ۔ بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے ۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ۔ ازاں جملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے :

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلّیٰ را

---

۱ ۔ صفاریوں میں تین بادشاہ ہوئے ہیں ، چالیس برس ان کی حکومت رہی ۔

۲ ۔ ویلمیوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے ، جن کی حکومت ۲۳۸ برس رہی ۔

شیخ علی حزیں نے بارھویں صدی هجری میں جبکہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی، اس کو دیکھا ھے - وہ اپنی سوانح عمری میں اس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ھے کہ ”شیراز کی آب و ھوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ھے، جس قدر چاھو کتاب کے مطالعے اور فکر و غور مضامین میں مصروف رھو، کبھی جی نہ اکتائے گا“۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ھوا کی خوبی اورعمارات کی لطافت و خوشی اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قوی پر عجیب اثر رکھتی ھے - یہی سبب ھے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعراء پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ھوئے ھیں - شیخ نے بھی بوستان کے دیباچہ میں اھل شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ھے جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا - شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعراً و مصنفین ابتدأ سے اخیر تک اٹھے ھیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ھے ان کی تعداد سے اندازہ ھو سکتا ھے کہ اس شہر کی خاک علم و ھنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ھے اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ھے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا -

شیخ کا نام - نسب - ولادت اور بچپن

اس کا نام شرف الدّین اور مصلح لقب اور سعدی تخلّص ھے - سرگورا وسلی نے اس کی ولادت ۵۸۹ھجری مطابق ۱۱۹۳عیسوی میں لکھی ھے - مگر تحقیق[1] یہ ھے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں

---

۱ - اس کی ولادت کا حال کسی نے نہیں لکھا ھے - صرف سال وفات سب نے لکھا ھے - یعنی سنہ ۶۹۱ھ اور اس کی عمر ۱۰۲ یا ۱۱۰

بقیہ حاشیہ ۱۴ پر

پہلے اتابرک مظفر الدّین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے - شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ[۱] بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا - چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اس لیے اس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا - شیخ کا باپ جیسا کہ اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک با خدا اور متورع آدمی تھا - (شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزے کے مسائل اس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اس کو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا)- عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا - باپ اس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجرو توبیخ کرتا تھا - شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے - چنانچہ وہ بوستان میں کہتا ہے :

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳ :

یا ۱۲۰ برس کی بتائی ہے - پس کم سے کم عمر ماننے سے اس کی ولادت ۵۸۹ھ میں قرار پاتی ہے، لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابو الفرح ابن جوزی جو بغداد میں اس کا جلیل القدر استاد تھا، اس کی وفات کے وقت جو کہ قطعاً سنہ ۵۹۷ھ میں ہوئی ہے، شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقعہ ہے - اسی لیے اس کی عمر ۱۰۲ برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے -

۱ - بوستان میں تکلہ کو شاہان پیشین میں لکھا ہے - حالانکہ سعدی اس کے وقت میں پیدا ہو لیا تھا - اس کا سبب یہ ہے کہ بوستان تکلہ سے چوتھے باشاہ یعنی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے - پس شاہان پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے، نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے -

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت
نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت
بخُردی بخورد از بزرگاں قفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اس کو تربیت کیا ہوگا ، کیونکہ اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اس کی ماں زندہ تھی ۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدّین شیرازی جو کہ محقّق طوسی کا شاگرد رشید اور ہلاکو خاں کا مصاحب خاص تھا ، شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا ۔ مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں اور بھانجوں میں نا زیبا معلوم ہوتی ہے ۔ بہر حال شیخ اور علامہ دونوں ہم عصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں ۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زھد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی ۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا ، مگر اس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اس کے قرب و جوار میں علماء و مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطّۂ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے ، بزرگوں سے سنا تھا ۔ قاعدہ ہے کہ

بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا ان کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود ان کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے ، اسی لیے تحصیل علم کا شوق اس کو دامن گیر ہوا ۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا ، علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے ، مدرسہ عضدیہ جو کہ عضد الدولہ ویلمی نے قائم کیا تھا اور اس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے ، لیکن اس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا ۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل ، رحم دل ، بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی ۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا ۔ اس کی غیبت کے زمانے میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے ۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک ازبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آ کر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا ۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار ، بلکہ ناممکن تھی ۔ اس کے علاوہ امن کے زمانے میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں ۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا ۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اس نے شیراز سے تنگ آ کر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے ۔

دلم از صحبت شیراز بکلّی بگرفت
وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم

سعدیا حبّ وطن گرچہ حدیثے ست صحیح
نتواں مُرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ :- میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آ گیا - اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو - اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں ، سختی سے مرا نہیں جاتا -

اس زمانے میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلاد اسلام میں جا بجا کھلے ہوئے تھے جہاں دور دور سے طالب علم آ آ کر علم تحصیل کرتے تھے - ہرات ، نیشا پور ، اصفہان ، بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے - ان کے سوا شام[1] ، عراق اور مصر وغیرہ میں جگہ جگہ مدرسے جاری تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی ، جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے سنہ ۴۵۹ھ میں بنوایا تھا - ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسے سے تعلیم پا کر نکلے ہیں ، جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں - یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ

---

۱ - ان میں سے مدرسہ ناصریہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبرس میں اور مدرسہ رواحیہ رواحہ کے پوتے زکی ابوالقاسم ہبۃ اللہ کا ہے اور نیز مدرسۂ ست‌الشام خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دارالحدیث ملک العادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ وزیر صفی الدین کا قاہرہ میں اور نوریہ نور الدین ارسلان شاہ صاحب موصلی کا موصل میں بہت مشہور تھے - ان کے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسہ ثقفیہ قاہریہ ، عزیزیہ ، عزیہ ، زینیہ ، نفیسیہ ، علائیہ ، وغیرہ وغیرہ بیت المقدس ، موصل ، بغداد ، دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے -

جو علماء یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے ، پھر ان کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا ۔ امام ابو حامد غزّالی ، شیخ عراق عبد القادر سہروردی ، آستاد الائمہ ابو حامد عماد الدین موصلی اور آور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی ۔ شیخ کو اس مدرسے میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اس کا ہم وطن شیخ ابو اسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرۂ آفاق تھا ، مدت تک اس مدرسے کا متّولی رہا تھا ۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متّولی شیخ ابو اسحاق کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسے سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا ۔

الغرض شیخ نے مدرسۂ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ بوستان میں اس نے تصریح کی ہے ، وہاں سے اس کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا ۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی ہے، جس کا لقب جمال الدّین ہے ۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا ۔ بے شمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں ۔ کہتے ہیں اس نے مرتے وقت وصیّت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے ان کا تراشہ میرے حجرے میں جمع ہے ، مرنے کے بعد جب مجھ کو نہلائیں تو غسل کے لیے اس تراشے سے پانی گرم کریں ۔ چنانچہ اس کی وصیّت کے موافق عمل کیا گیا اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا ۔

جس زمانے میں شیخ بغداد میں علّامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا ، اس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا ۔ دولت شاہ سمرقندی اور سرگورا وسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے

کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور ان سے علم تصوّف اور طریق معرفت و سلوک حاصل کیا اور پہلی مرتبہ انہیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا ، مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیوں کہ شیخ عبد القادر جیلانی کی وفات سنہ ۵۶۱ھ میں ، یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی - البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدّین سہروردی سے اس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ ان کے ساتھ رہا ہے -

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اس کے ہم عمر اور ہم سر لوگ اس کی خوش بیانی اور حسن تقریر پر رشک کرتے تھے - چنانچہ ایک بار اس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے ، جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائل علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے - اُستاد یہ سن کر شیخ پر غصے ہوا اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک و حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بد گوئی اور غیبت کو برا نہیں سمجھتے - تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو ، وہ رشک و حسد سے اور تم بد گوئی و غیبت سے -

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا - طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا اور علّامہ ابو الفرح ابن جوزی ہمیشہ اس کو سماع سے منع کرتا تھا ، مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی لیکن علماء کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی - آخر ایک روز کسی مجلس میں اس کو ایک بد آواز قوال سے پالا پڑا اور بہ ضروت ساری

رات اس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے مُنڈاسا آتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوّال کی نذر کیں ۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا ۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے ۔ میرا مربّی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا ۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرّف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی ۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی صحبت سے عالم طالب علمی میں تصوّف اور درویشی کے خیالات اس کے دل سے اُتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں چلا آیا ۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اس طریقے کو چھوڑ کر اس کوچہ میں قدم رکھا ، کہا درویش صرف اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں ۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اس کو کسی سر زمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا ۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے :

بعد از عراق جائے خوش نایدم ہوائے
ساقی بزن نوائے زاں پردۂ عراق

جس زمانے میں شیخ نظامیۂ بغداد میں پڑھتا تھا ، اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا ، مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی ۔ عباسیہ کا اخیر خلفیہ مستعصم باللہ سریر خلافت پر متمکّن تھا اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھالا

لیا تھا - اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السّلام بغداد میں جمع تھے - عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے - خلیفہ کی عظمت اور رعب دواب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے شہر یار اور فرمانروا بارگاہ خلافت میں مشکل سے بار یاب ہوتے تھے - قصر خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بمنزلۂ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا ، جس کو امراء اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے - تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وهاں ایک مدّت پہلے سے رستے کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے - الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور پھر اسی آنکھ سے اس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایۂ اقتدار یورپ ، ایشیا اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اهل لشکر اور اهل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا - شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم کی تباہی اور عبّاسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اس کی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے جو ہلاکو خان کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے - ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا ، جس نے اس کے دل میں قوم کی دلسوزی ، بادشاہوں کی اصلاح ، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقے کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیراندیشی میں صرف کی - مستعصم باللہ کا

نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیے کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

ابیات

(اشعار)	(ترجمہ)
آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین	آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے
اے محمدؐ گر قیامت می براری سر زخاک سر بر آور وین قیامت درمیان خلق بین	اے محمد (صلعم) اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔
نازنینان حرم را خون خلق نازنین زاستان بگذشت وما را خون دل از آستین	محل کے ناز پروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا۔
زینہار از دور گیتی و انقلاب روزگار در خیال کس نہ گشتے کانچنان گردد چنین	دنیا کی گردش اور زمانے کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے، یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔
دیدہ بردار ای کہ دیدی شوکت بیت الحرام قیصران روم سر بر خاک وخاقان بر زمین	جنہوں نے اس بیت الحرام کی شان و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھتے تھے وہ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔

(اشعار)	(ترجمه)
خون فرزندان عم مصطفیٰؐ شد ریخته هم بران خاکے که سلطانان نهادندے جبیں	که پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اس خاک پر بہہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑا کرتے تھے -
بعد ازیں آسائش از دنیا نباید چشمداشت قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگیں	آئندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہیے کیوں که انگوٹھی پر سے جب نگین جاتا رہتا ھے تو نری کاونس رہ جاتی ھے -
دجله خونابست زیں پس گر نهد سر در نشیب خاک نخلستان بطحا را کند باخون عجیں	دجله کا پانی نکتر لہو ہو گیا ھے - اگر اب جاری رہے گا تو نخلستان بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دے گا -
نوحه لائق نیست بر خاک شهیدان زانکه هست کمتریں دولت مر ایشان را بهشت برتریں	شہیدوں کی خاک پر نوحے کی کیا ضرورت ھے، کیوں که ان کے لیے ادنیٰ نعمت فردوس بریں ھے -
لیکن از روئے مسلمانی و راه مرحمت مهربان را دل بسوزد در فراق نازنیں	ھاں مگر رحم اور اسلام کی همدردی کے سبب دوست کا دل دوست کی جدائی میں کڑھتا ھے -
باش تا فردا که بینی روز داد و رستخیز کزلحد باروئے خون آلوده برخیزد دفیں	کل تک صبر کرو، قیامت کے دن دیکھ لینا که قبر سے اهل قبر لہو بھرا منه لے کر آٹھیں گے -
تکیه بر دنیا نباید کرد و دل بروے نهاد کاسماں گاہے بمهرست اے برادر گه بکیں	یارو دنیا پر بھروسا کرنا اور اس سے دل لگانا نہیں چاهیے - کیوں که آسمان کبھی دوست ھے اور کبھی دشمن -

(اشعار)	(ترجمہ)
زور بازوے شجاعت بر نیاید با اجل چون قضا آید نماند قوت رائے رزین	شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آ سکتا اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی قوت جاتی رہتی ہے -
تیغ هندی بر نیاید روز هیجا از نیام شیرمردے را که باشد مرگ پنهان در کمین	جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے اس کی اصیل تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی -
تجربت بےفائده ست آن را که برگردید بخت حمله آوردن چه سود آن را که برگردید زین	جب نصیبہ پلٹ گیا پھر اس کا امتحان کرنا بے فائدہ ہے اور جب زین الٹ گیا پھر حملہ کرنا فضول ہے -
کرگسانند از پے مردار دنیا جنگجوے ای برادر گر خردمندی چو سی‌مرغان نشین	یارو مردار دنیا کے لیے گدھ آپس میں لڑ رہے ہیں - اگر تم عقلمند ہو تو سی‌مرغوں کی طرح الگ بیٹھو -

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا - اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی ، نیکی ، لیاقت اور انصاف بالکل نہ تھا ، تکبّر اور غرور نے اس کے دماغ کو مختّل کر دیا تھا ، غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اس کے بیٹے ابوبکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرف داری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدّی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ، مگر اس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا ، لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا -

مستعصم باللہ کو کیسا ھی نالائق اور قابل نفریں سمجھو مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے آٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ایکبارگی ان میں تزلزل آ گیا اور چند روزمیں ان کا اقتدار صفحۂ ھستی سے یک قلم محو ھو گیا ۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا ، یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ھو سکتی تھی کہ رسول اللہؐ کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ھاتھ سے آب باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفاے راشدین کے ھنرمند ھاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ھو گیا ۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ھے اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ھوتے تو ان کو بھی ایسا ھی مرثیہ لکھنا پڑتا ۔(مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ھے ۔ شعر

ھمارے بعد بہت روئے ھم کو اھل وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

القصہ شیخ مدرسۂ نظامیہ سے نکل کر مدت دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت کرتا رھا ۔ جب کتاب کے مطالعے سے اس کا جی سیر ھو گیا تو نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا ۔ بعض تذکروں میں لکھا ھے کہ اس نے تیس برس کی عمر تک تحصیل علم کی ھے اور تیس برس سیر و سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی میں بسر کیے ھیں ۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی حصے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں اور غالباً یہ مضمون منو شاستر سے اخذ کیا گیا ھے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا

ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا ۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ "شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرۂ کامل رکھتا تھا "۔ اگرچہ اس کی شہرت طبقۂ علما میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ شعرأ میں ہوئی مگر اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقّق اور سلجھا ہوا عالم تھا ۔ بعض موقعوں پر فقہا اور قضاۃ کے مجمعوں میں اس کو بحث و مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو اس کی رائے سب پر غالب رہی ہے ۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اس کی جان پہچان کم تھی ، کسی تقریب سے قاضی شہر کی مجلس میں اس کا گزر ہوا ، اس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس میں تمام علما و فقہا کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے ۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا ، خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا اور مشکل سے پائیں مجلس میں جگہ ملی ۔ اس وقت کسی مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا ۔ شیخ نے دور ہی سے باواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں ۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا ۔ شیخ نے اس مسئلے کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا ۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی ، قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اُتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا ۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے ۔ جب لوگ مجھ کو بھی مولانا اور صدر کبیر کہہ کر پکاریں گے تو غریب آدمی مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم ہوں گے اور پھٹے پرانے کپڑے والوں سے بھی میں تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا ۔ شیخ نے اپنی یہ سرگزشت بوستان میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگزشت ہے مگر اخیر

کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خاص اپنی روئداد لکھی ہے -

شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے مگر ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلسفے اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی - زیادہ تر اس کی ہمت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسۂ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اس کو عمدہ دستگاہ تھی - طالب علمی ہی کے زمانے میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کے ہم جماعت لوگ اس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ بلاد شام میں اس نے مدتوں وعظ کہا ہے - وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہل مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا - میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا کہ (وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ) کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا - اس نے میرا بیان سن کر ایسا پر جوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چیخ گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی -

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی- عرب ، شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اس کی مادری زبان ہو گئی تھی - وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا اور صرف روزمرّہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ عربی قصائد فصیح اور با مزہ اس کی کلّیات میں موجود ہیں - اس کے سوا بت خانۂ سومنات کے قصے میں اس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا - سرگورا وسلی لکھتے ہیں کہ ایشیاٹک جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ ۱۸۴۳ء میں فرانس کے مشہور محقّق ام گارسن ڈی ٹیسی

نے لکھا ہے کہ ''سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان یعنی ریختہ میں جب کہ وہ سومنات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے''۔ مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانے میں ہوا ہے ، جب کہ ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی ۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اسی نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اس کے مشہور ہیں ۔ اشعار :

قشقہ چو دیدم بررخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتا کہ در رائے بادرے اس ملک کی یہ ریت ہے
ہمنا تمن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ در ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں ان اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے ۔ مگر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے ۔

سرگورا وسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اس نے اٹھارہ مختلف زبانیں ان ملکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے ۔ اس بیان میں ظاہرا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ ایک مدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے ۔ شام ، عراق ، فلسطین ، مصر، یمن اور ہندوستان میں مدت دراز تک مقام کرنا خود

اس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے ۔ پس ضرور ہے کہ وہ ان ملکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو ۔ اس کے سوا اس نے اور بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے ، جن میں سے اکثر کا ذکر گلستان اور بوستان میں کیا ہے ۔

شیخ کی سیاحت کا حال

سر گورا وسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیّاحوں میں ابن بطوطہ کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیّاح ہم نے نہیں سنا ۔ اس نے ایشیائے کوچک ، بربر ، حبش ، مصر ، شام ، فلسطین ، آرمینیا ، عرب ، جملہ ممالک ایران ، اکثر ممالک توران ، ہندوستان ، رودبار ، ویلم ، کاشغر اور جیجون سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستھین[1] وال تک کی سیر کی تھی ۔ صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندوستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ ازاں جملہ ایک دفعہ پٹھان اغلمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی میں آیا ہے'' ہمارے نزدیک یہ مضمون محض بے سروپا ہے ۔ اغلمش کوئی بادشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا ، شاید سلطان التمش کے دھوکے میں اغلمش لکھا گیا ۔ بے شک شیخ نے اغلمش کا ذکر گلستان میں ایک جگہ کیا ہے ، جہاں لکھا ہے کہ ''سرہنگ زادۂ بردر سرائے اغلمش دیدم'' مگر ہندستان میں کوئی اغلمش یا سرائے اغلمش نہیں سنی گئی ۔ سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی ، اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہ ہوا ہے ۔

---

۱ - ستھین وال سے مراد شاید سد سکندری ہے ، کیوں کہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں سد سکندری تک گیا ہوں ۔

شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جواھر الاسرار میں لکھا ھے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ھندوستان میں آیا ھے ۔ مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں ھے بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ھوتا ھے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کےلیے آنا خلاف قیاس ھے ۔ امیر خسرو کی ولادت سنہ ۶۵۱ھ میں ھوئی ھے ، جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ ھو چکی تھی ۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بفرض محال پچیس برس ھی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی تھی تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ھونی چاھیے ۔ پس یہ کیوں کر خیال میں آتا ھے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانۂ وقت اور مقبول خاص و عام ھو ، ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سن کر ایران سے ھندوستان میں آئے ۔ البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ثابت ھوتا ھے کہ سلطان غیاث الدّین بلبن کے بیٹے قاآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جس کو خان شہید کہتے ھیں ، شیخ سے دو بار درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئیے اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے اس لیے ان کا کلام بھی شیخ کے ملاخطے کے لیے بھیجا ۔ شیخ اس وقت بہت معمر ھو گیا تھا ۔ اس سبب سے خود آ نہ سکا ، لیکن دونوں دفعہ اپنے دو دیوان اپنے ھاتھ کے لکھے ھوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اس جوھر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاھیے ۔

۱۲ شیخ کا ھندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ھے ۔ صرف بوستان سے اتنا معلوم ھوتا ھے کہ اس نے سومنات سے نکل کر ایک بار مغربی ھندوستان کا دورہ کیا ھے اور وھاں سے بحر ھند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ھے ۔

۱۳ شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور بوستان سے ثابت ھوتے

ھیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ، ترکستان اور تاتار تک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے ۔ جنوب میں سومنات تک آیا اور ایک مدت تک یہاں ٹھہرا اور سومنات سے مغربی ھندوستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب کو چلا گیا ۔ شمال اور مغرب کی طرف عراق ، عجم ، آذر بیجان ، عراق ، عرب ، شام ، فلسطین اور ایشیائے کوچک میں بارہا اس کا گزر ھوا ۔ اصفہان ، تبریز ، بصرہ ، کوفہ ، واسط ، بیت‌المقدس طرابلس الشرق ، دمشق ، دیار بکر اور اقصلائے روم کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اس کی آمد و رفت رھی ہے ۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اس کا بار بار جانا اور وھاں ٹھہرنا معلوم ھوتا ہے ۔ ھندوستان سے مراجعت کے وقت یمن میں جانا ، صفا میں ایک مدت تک قیام کرنا ۔ حجاز میں پہنچنا ، اسکندریہ ، مصر اور حبش کے واقعات اس کے کلام میں مذکور ھیں ۔

شیخ نے دریا میں بھی بارھا سفر کیا ہے ۔ خلیج فارس ، بحر عمان ، بحر ھند ، بحر عرب ، بحر قلزم اور بحر روم میں اس کے متعدد سفر ثابت ھوتے ھیں ۔ چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ھوتی ۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ھیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیے ھیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ثابت ھوتا ہے ۔ وہ ایک سفر کا حال بوستان میں اس طرح لکھتا ہے کہ بیابان فید میں ایک رات نیند کا ایسا غلبہ ھوا کہ میں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رھا ۔ پیچھے سے ایک شتر سوار آیا اور اس نے اونٹ کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کر لیا ہے جو جرس کی آواز سن کر بھی نہیں اٹھتا ۔ بیابان فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے، ایک صحرائے لق و دق ، چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے ۔ جو

حجّاج کوفه سے مکّه کو جاتے هیں ان کے رستے کے بیچوں بیچ فید ایک بستی هے جس کے نام سے یه صحرا مشهور هے - فید کوفه سے تقریباً تین سو پچیس میل هے اور اسی قدر مسافت پر وهاں سے مکّه معظمه هے - اس صحرا میں پانی نهایت کمیاب هے اور آبادی کهیں نظر نهیں آتی ، ایسی راه سے پیاده پا حج کو جانا ظاهر کرتا هے که شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اٹھائی هیں -

کریم خاں زند نے اپنے عهد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطه بنوایا هے جو هفتن کے نام سے مشهور هے - اس میں سات مجهول الاسم درویشوں کی قبریں بنی هوئی هیں اور احاطے کے دروازے پر شیخ سعدی اور خواجه حافظ کی شبیهیں نصف قد کی لگی هوئی هیں - کپتان کلارک نے جو بوستان کا ترجمه انگریزی میں چھاپا هے اس میں شیخ کی اُس تصویر[۱] کا فوٹوگراف بھی چھاپا هے - شیخ کی شبیه میں ایک کشکول اس کے هاتھ میں هے اور ایک تبر اس کے کندھے پر هے ، جو که اس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت هے -

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یه معلوم هوتا هے که وه همیشه بے سرو سامان اور متوکّل درویشوں کی طرح سفر کرتا رها هے اور بعض موقعوں پر اس کو حالت سفر میں نهایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پهنچی هیں -

ساتویں صدی هجری اور بارهویں صدی عیسوی کے وسط میں جب که صلیبی لڑائیوں کا سلسله فلسطین میں ختم نه هوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کی باهم سخت خصومت اور عداوت هو رهی تھی ، شیخ پر ایک سخت واقعه گزرا هے ، جس کا ذکر

---

۱ - بینی صاحب، ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفر نامه میں اس تصویر کا حال مفصل لکھا هے -

گلستان کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہل دمشق سے ناراض ہو کر اس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا ۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اس کو پکڑ کر قید کر لیا ۔ اس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرق لڑ یپولی میں شہر کے استحکام اور حفاظت کے لیے خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی بلگیریا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے ساتھ لائے تھے) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا ۔ شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگا دیا ۔ مدّت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا ، اس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے ۔ شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے ! جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجے میں گرفتار ہے ۔ رئیس حلب کو اس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا ۔ اس کی ایک بیٹی نا کتخدا تھی ، شیخ کا نکاح سو دینار مہر مقرر کر کے اس کے ساتھ کر دیا ۔ چند مدت وہاں گزری ، مگر بیوی کی بد مزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آ گیا ۔ ایک بار اس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ کیا آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں بے شک میں وہی ہوں ۔ دس دینار دے کر مجھے خریدا اور سو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا ۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام کے شہروں میں سقائی کی ہے ۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے ۔ معلوم ہوتا

ہے کہ اس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گزری ہیں ۔ وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا ، مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا ۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگ دل کوفہ کی جامع مسجد میں پہنچا ۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے ، اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے ۔

عالم غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا ، مگر شیخ ایسے موقعوں پر خود داری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا ۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا ، نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی ۔ اس زمانے میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولت مند تھا ۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی ۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے ، شیخ کے پاس آئے اور اس ہیجڑے کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی ۔ شیخ نے (باوجود اس کے کہ وہ مدتوں واعظ رہ چکا تھا) ۔ ان کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے تو بھی کتّے کا جھوٹا نہیں کھاتا ۔

شیخ کے وقائع سفر میں جو کہ اس نے گلستان اور بوستان میں بیان کیے ہیں ، سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے ، جو بوستان کے آٹھویں باب میں مذکور ہے ۔ یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار

ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں ؟ اس بات کی تحقیقات کے لیے میں نے ایک برھمن سے ملاقات پیدا کی ۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمّت اور حقارت کی ۔ برھمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی ، سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا ، میں نے مصلحتاً ان کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کہی ، میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں ، لیکن چونکہ میں نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں ، اس لیے اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تا کہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں ۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا آج رات کو تو مندر میں رہ ، تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی ۔ میں رات بھر وہاں رہا ، صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا ، جیسے کوئی دعا مانگتا ہے ، یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے ۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برھمن نے ہنس کر مجھ سے کہا ''کیوں اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا؟'' میں ظاہر داری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا ۔ سب برھمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے ۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برھمن بن گیا ۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے ، میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا ۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا ، جس کے پیچھے ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی ۔ معلوم ہوا کہ جب اس ڈور کو کھینچتا ہے ، فوراً اس مورت کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے ، اسی کو عام لوگ اس مورت کا کرشمہ سمجھتے ہیں ۔ اس پجاری نے جب دیکھا

کہ راز فاش ہو گیا ہے ، وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا ، میں بھی اس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو پکڑوا کر مروا نہ ڈالے اس کو پکڑ کر ایک کنویں میں گرا دیا ، اس کے بعد میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندوستان میں ہوتا ہوا یمن کے راستے حجاز میں پہنچا ۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سیکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سیکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے ، وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیوں کر ملا کہ تمام مندر میں اس کے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا ۔ اس کے سوا ایسے سناٹے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا پردے کے پیچھے ایک پجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے تھا اور کیوں تھا ؟

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اصل واقعے یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں دھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو ، مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعے کی تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے نظم میں پوری پوری نہیں کھچ سکی ۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ وغیرہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعے سے دور جا پڑتا ہے ۔ پس اگر اس واقعے سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتا ، ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے ۔ مثلاً شیخ نے بوستان کے اسی باب میں ایک بادشاہ زادہ کی

حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے - مطلب یہ ہے کہ گھوڑے سے گر کر اس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ہر پھر نہ سکتی تھی ، مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہو گئی - کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملنے کو آیا تو اس کی طرف کچھ التفات نہ کیا - طبیب وہاں سے دل میں نا خوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ، دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائے گا ، اس سے بادشاہ کو چھینک آئی اور اس کی گردن جیسی چوٹ لگنے پر ہوگئی تھی ویسی ہی پھر ہوگئی - اسی حکایت کو شیخ نے ایک اور چونتیس بیت کی مثنوی میں جو بحر ہزج میں ہے ، بیان کیا ہے اور یہ اس کی کلّیات میں موجود ہے، ان دونوں مثنویوں میں قصّے کے جزئیات مختلف ہیں - مختصر حکایت میں سر زمین یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے - ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بُوٹی بھیجی تھی اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا - ایک جگہ بادشاہ کا قصہ لکھا ہے اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا ، ایک جگہ لکھا ہے کہ اسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی ، دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں -

س سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشرطیکہ ناظم کو حسن بیان اور زینت الفاظ کا پورا پورا خیال ہو ، قصّے کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے - پس بہ نسبت اس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اس کے بیان کو اس مقام پر ادائے مطلب میں قاصر سمجھا جائے -

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت

میں تحصیل علم کے لیے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا اور سنہ ۶۲۳ھ میں وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانے میں وطن نہیں آیا کیوں کہ اس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر و خراب دیکھی تھی۔ اتابک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدّین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا، مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خاں ابوبکر اپنے باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے فارس کو جو دو سو برس سے مورد آفات و حوادث تھا، چند روز میں سر سبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مؤرّخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کیے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اس کی شہرت سن کر آتے اور ان کی کمال تعظیم و احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں، عبادت خانے، مدرسے اور مسجدیں جو ویران ہو گئی تھیں، اس کے عہد میں آباد کی گئیں اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حاذق طبیب اس پر مامور کیے۔ اپنی دانش مندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو ہمیشہ مغول تاتار کے سیلاب بلا سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی، محفوظ رکھا اور سنہ ۶۲۳ھ[1] سے سنہ ۶۵۸ھ تک سلطنت کی۔ مدت تک اس کے عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رخ نہیں کیا اور اطراف و جوانب میں سیر و سیاحت کرتا رہا، مگر جب ابوبکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے

---

۱ - یہاں دونوں جگہ اصل اڈیشن میں ''عیسوی'' لکھا ہوا ہے مگر دراصل ''ھجری'' ہے۔ (اسماعیل پانی پتی)

گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و امان قائم ہو گیا ، تب شام سے عراق عجم ہوتا ہوا اور اصفہان میں ٹھہرتا ہوا ، جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے ، شیراز میں پہنچا - شیخ کے کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے ، جس سے ثابت ہے کہ اس نے ایک مدت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی - وہ قطعہ بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے - قطعہ :

قطعہ

(اشعار)	(ترجمہ)
ندانی کہ من در اقالیم غربت چـرا روزگارے بکردم درنگی	تجھ کو معلوم نہیں کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں توقف کیا ؟
بروں رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی	میں ترکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہو رہا تھا -
ھمہ آدمی زادہ بودنـد لیکن چـو گـرگاں بخوں‌خوارگی تیـز چنگی	سب آدمی کے بچے تھے لیکن خونخواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے -
دروں مردمے چوں ملک نیک محضر بـروں لشکرے چـو ھـزبـران جنگی	شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باھر لشکر کے لوگ جنگی شیروں کے موافق تھے -
چو باز آمـدم کشور آسودہ دیـدم پلنگاں رھـا کـردہ خوئے پلنگی	جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی -

(اشعار)	(ترجمہ)
چناں بود در عہد اول کہ دیدم جہاں پر ز آشوب و تشویش و تنگی	اگلے زمانے میں جب کہ ملک کو آشفتہ اور پریشان اور تنگ دیکھا تھا ، ملک کا وہ حال تھا -
چنیں شد در ایام سلطان عادل اتابک ابوبکر بن سعد زنگی	اور اب بادشاہ عادل ابوبکر بن سعد زنگی کے عہد میں یہ حال ہو گیا ہے -

شیراز میں پہنچ کر ظاہراً شیخ نے جامۂ علم و فضیلت اُتار کر بالائے طاق رکھ دیا تھا - کیونکہ اتابک ابوبکر میں باوجود ان تمام خوبیوں کے جو اُوپر مذکور ہوئیں ایک سخت عیب بھی تھا ، وہ ہمیشہ علما و فضلا سے بدگمان رہتا اور جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا اور ان کے ساتھ کمال ارادت و عقیدت ظاہر کرتا تھا - اسی بد گمانی کے سبب سے چند جلیل القدر آئمہ و علما کو اس نے جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا - ازاں جملہ امام صدر الدّین محمود واعظ اور امام شہاب الدّین تودہ پشتی اور مولانا عزّ الدّین ابراہیم قیسی کو کہ اقسام علوم میں یگانۂ روزگار تھے، بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا - قاضی عزّ الدّین علوی جو کہ سندی سید اور دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا ، اس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا - صاحب سعید عمید الدّین اسعد کو جو کہ بے مثل ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا ، ماخوذ کیا اور مع اس کے بیٹے تاج الدّین محمد کے ایک قلعے میں قید کر دیا - یہاں تک کہ وہ قید ھی میں مر گیا -

اسی سبب سے اھل علم اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جہلا مشایخ کے لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے - تاریخ وصّاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر

ابوبکر کے دربار میں آیا ۔ اتابک نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی، اور جب نماز مغرب کا وقت آیا تو اسی کو امام بنایا ۔ شاہ صاحب نے قرأت غلط پڑھی مگر جس قدر انھوں نے قرأت میں غلطیاں کیں، اسی قدر اتابک کو ان کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر انھیں رخصت کیا ۔

پس شیخ کے لیے علماء کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیوں کہ بہت سی صفات اس میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اس کا مرجع خلائق بننا ایک ضروری امر تھا۔ مثلاً علم و فضل، شاعری، لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی، فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ اور اھل علم کے مرجع خلائق بننے سے ابوبکر ھمیشہ خائف رھتا تھا ۔ اس کے علاوہ بادشاھوں اور عاملوں کے چال چلن پر خوردہ گیری کرنی، ریاکار فقیروں اور جاھل درویشوں کی قلعی کھولنی اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید خیالات اپنی نظم و نثر میں ظاھر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا، اور اس غرض کے لیے علما اور واعظین کے لباس میں رھنا ھرگز مناسب نہ تھا ۔ ظاھرا وہ اسی سبب سے جیسا کہ گلستاں کے دیباچے میں مذکور ھے، ابوبکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا ۔ زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جس کا نہایت درد ناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ھے، اس سے ارادت اور عقیدت تھی اور اسی نام پر گلستاں لکھی گئی ھے ۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاھوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ھوتی، مگر شیخ نے جس کے وقت میں ھر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا، اس فرض کو پورا پورا ادا کیا ۔ سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور ان کی بد خصلتیں جس طرح اس نے بیان کی ھیں آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ھیں، مگر اس نے ایسے لطیف پیرایوں میں ان پر چوٹیں کی ھیں کہ کسی کو

اس پر گرفت کرنے کا موقع نہیں ملا ۔ اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اس نے تعریضیں کی ہیں ۔ کہیں مدحیہ قصائد میں اوّل مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور ان کو ظلم اور تعدّی کے برے نتائج سے متنبّہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیت کے حقوق جتائے ہیں اور ان کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں ۔ اتابک ابوبکر جو علماء کا مخالف اور مشائخ و زہاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا ، اس کی تنبیہ کے واسطے گلستان اور بوستان میں اس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں ۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتے کھاتا تھا ۔ ایک بادشاہ اس کی زیارت کو گیا اور اس کو شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بستان سرا میں اتارا ۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کا آرام اور آسائش پائی ، شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا ، ہیئت اور صورت بالکل بدل گئی ۔ ایک دن بادشاہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ، درویش کو اچھی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا جس قدر مجھ کو علماء اور زہاد سے محبت ہے ، ایسی اور کسی گروہ سے نہیں ۔ فیلسوف وزیر نے عرض کیا ، حضور شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لیے علماء کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قائم رہیں ۔

ایک اور اس سے بھی زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل اتابک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے، یعنی ''ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی اس نے منّت مانی کہ

اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو اس قدر روپیہ زاھدوں کی نذر کروں گا ۔ جب اس کی مراد پوری ہو گئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاھدوں کو جا کر دے آئے ۔ غلام بہت ھوشیار اور زیرک تھا ، سارے دن ادھر آدھر پھرا اور شام کو تھیلی ھاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ھی چلا آیا اور عرض کیا ، حضور ! ھر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاھد نہیں ملا ۔ بادشاہ نے کہا ، تو کیا بکتا ھے ! میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاھد سے کم نہ ھوں گے ۔ کہا حضور ! جو زاھد ھیں وہ تو لیتے نہیں اور جو لیتے ھیں وہ زاھد نہیں ۔ بادشاہ یہ سن کر ھنس پڑا اور فرمایا ''جتنی کہ مجھ کو درویشوں اور خدا پرستوں سے عقیدت ھے ، اسی قدر اس مردود کو ان سے عداوت ھے ، مگر کہتا سب سچ ھے ''۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں گلستاں اور بوستاں میں موجود ھیں ۔ گلستاں کی ایک حکایت میں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ھے ، اس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطین عہد اور مشائخ روزگار کے عیب اور برائیاں بیان کی ھیں ۔ اس حکایت میں اس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ھے ، جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاھوں کا طرف دار اور مداح قرار دیا ھے ۔ مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولت مندوں کی مذمّت کرتا ھے اور شیخ ھر دفعہ اس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ھے مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ھے ویسی ھی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ھے اور اس سے صاف معلوم ھوتا ھے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ھے جو محض درویشوں اور تونگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ھے ۔

بادشاھوں کے جور و ظلم اور بیباکی و سفّاکی دیکھتے دیکھتے

شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیرخواہی کا سچّا جوش پیدا ہو گیا تھا ، جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا ۔ ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علماء اور صلحاء سے ملاقات کی تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدّین جوینی صاحب دیوان اور اس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاؤالدّین جوینی جو کہ سلطان اباقا خان[1] کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے، ان سے بھی ملاقات کرے ۔ ایک روز ان سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا ، راہ میں دیکھا کہ اباقا خاں کی سواری آتی ہے اور اس کے دونوں وزیر اس کے ہمراہ سوار ہیں ۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کترا کر نکل جائے مگر دونوں بھائیوں نے اس کو پہچان لیا اور فوراً گھوڑوں سے اُتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیے ۔ بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا ، حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدّین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اس راہرو آدمی کے برابر نہیں کی ، یہ کون شخص ہے ؟ جب دونوں بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے تو اباقا خان نے خواجہ شمس الدّین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا کہ جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی ۔ صاحب دیوان نے عرض کیا کہ حضور یہ ہمارا شیخ ہے ۔ حضور نے سنا ہوگا ۔ شیخ سعدی اسی کا نام ہے اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے ۔ اباقاخان نے کہا اس سے ہم کو بھی ملواؤ ۔ چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے اور اس کو بادشاہ کے حضور میں لائے ۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت کرو ۔ شیخ نے کہا ، دنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی ، مگر نیکی یا بدی، اب تم کو

---

۱ ۔ ھلاکو خاں کا بیٹا جو اس کے بعد بادشاہ ہوا ۔

اختیار ہے جو منظور ہو سو لے جاؤ ۔ اباقا خان نے کہا اس مضمون کو نظم کر دو تو بہتر ہو ۔ شیخ نے اسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا ۔ قطعہ :

(شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد
حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی ست
وگر، نہ راعی خلق است ، زہر مارش باد
کہ ہر چہ میخورد از جزیۂ مسلمانی ست)

اباقا خاں یہ قطعہ سن کر آبدیدہ ہو گیا اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ؟ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ، ورنہ دوسری بیت ۔ اباقا خان شیخ کی آزادانہ پند و موعظت سے نہایت خوش ہوا اور شیخ کو بہت عزت سے رخصت کیا ۔

علی ابن احمد جامع کلّیات شیخ اس مقام پر لکھتا ہے کہ ''ہمارے زمانے کے مشائخ و علما ایسی بیباکانہ نصیحت ایک بقّال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے زمانے کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے ''۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اباقا خاں ہلاکو خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے ۔ اگرچہ اباقا خاں کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی ، لیکن بہر حال وہ اسلام سے بیگانہ تھا اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ۔ ایسا کام اسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدے کی امید ۔ جیسا کہ شیخ نے گلستاں میں خود لکھا ہے ''نصیحت بادشاہاں گفتن کسے را مسلّم است کہ بیم سر ندارد و امیدِ زر ''۔

سردار انکیانو جو بعد زوال خاندان اتابکّیہ کے سنہ ۶۶۷ ہجری میں سلطان اباقا خاں کے حکم سے صوبہ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا ، ایک مغل صاحب ہیبت و شان، نہایت رعب داب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا اور ہمیشہ علمائے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا اور اس کی ہیبت سے بڑے بڑے اھل منصب لرزتے تھے ۔ غالباً اس نے شیخ سے درخواست کی تھی، جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پند نامہ جو اس کے کلیات میں موجود ھے ، سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ھے ۔ اس پند نامے کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس زمانے کے بادشاہ ، حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے اور اس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے ۔ سردار ایکیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ھیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ھوئے ھیں ۔ یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و موعظت ھی میں ختم کر دیے ھیں ۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ھی تھی جیسی فارس اور عراق عجم میں ۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰؑ کی تربت پر معتکف تھا ، عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ھو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن کے حملہ کا اندیشہ ھے آپ میرے لیے دعا کریں ۔ شیخ نے کہا ''کمزور رعیت پر رحم کر تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رھے ۔ جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی اُمید رکھی اس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ اُمید باندھی ھے''۔

اگرچہ سلطنت عہد کے اعیان و ارکان میں شیخ کے معتقد اور

ارادت مند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدّین صاحب دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعۂ نظم کا نام صاحبیّہ رکھا ہے اور اس کا بھائی علاؤ الدّین جنس نے سب سے اوّل مغول تاتار کی فتوحات کے بیان میں تاریخ جہاں کشا لکھی ہے ، شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے ۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال ان دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

جوین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطّہ تھا ، یہ دونوں بھائی وھاں کے سندی سادات میں سے ہیں ۔ انھوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعے سے خانان تاتار کے عہد حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ھلاکو خاں نے وزیر سیف الدّین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدّین جوینی کو عطا کی تھی اور اس کے چھوٹے بھائی علاؤالدّین کو ملک بغداد اور اس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا ۔ ھلاکو خاں کے بعد جب اباقا خاں باپ کا جانشین ھوا، اس نے پہلے سے بھی زیادہ شمس الدّین کا مرتبہ بڑھا دیا اور سلطنت کی باگ بالکل اس کے قبضے میں دے دی ۔ اب اس نے مہمّات سلطنت کے انصرام ، سپاہ و رعیت کی دلجوئی اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی ۔ عراق ، خراسان ، بغداد ، شام اور آرمینیہ کے بادشاہ اور حاکم سب اس کے مطیع اور فرمانبردار تھے ۔ اس کی فیّاضی اور سخاوت کی دھوم دور و نزدیک پہنچی تھی ۔

باوجودیکہ اس کا حکم کنارۂ جیحون سے شام اور ایشیاے کوچک تک نافذ اور جاری تھا ، اس پر بھی وہ علماء و فضلاء کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا اور ان کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا ۔ کبھی کسی پر اس نے احسان نہیں جتایا ۔ ھر طبقے اور ھر درجے کے لوگوں کی تعظیم اور مدارات ان کے مرتبے

کے موافق کرتا تھا اور علاوہ کمالات علمی کے ادب اور شعر میں بھی اس کو ید طولیٰ حاصل تھا - زیادہ تر اسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شائع ہوا اور اسی کے فیض صحبت سے اباقا خاں کے بھائی سلطان[1] احمد نے اپنے گھرانے میں سب سے اوّل اسلام قبول کیا - آخر ارغون خاں برادر سلطان احمد کے ہاتھ سے سنہ ۶۶۳ ہجری میں شہید کیا گیا - شہادت سے چند ساعت پہلے اس نے تھوڑی سی مہلت چاہی تھی ، اس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام وصیت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلائے تبریز کو لکھا جو کہ تاریخ وصّاف میں بجنسہ منقول ہے اور جس سے اس کا کمال استقلال اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے -

اس کے چھوٹے بھائی علاؤ الدّین جوینی نے بغداد کی حکومت کے زمانے میں اس اجڑے اور ویران شہر کو جو کہ ہلاکو خاں کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا ، چند روز میں اپنے عدل اور شفقت اور دلجوئی رعایا سے از سر نو معمور کر دیا - نجف اشراف میں ایک نہر کھدوائی جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا اور فرات کا پانی کوفے کی مسجد میں لے گیا - تاریخ میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے، وہ اس فیّاض اور دانش مند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے - تاریخ جہاں کشا جو اس نے تاتاریوں کی فتوحات کے بیان میں لکھی ہے ، وہ ان تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں -

---

۱ - سلطان احمد کا نام اسلام کے پہلے نکودار تھا - تاتاریوں میں اس سے پہلے صرف برکہ خاں جوجی خاں کا بیٹا اور ہلاکو خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا ، جس کے پاس خوارزم و دشت قبچاق اور روس وغیرہ کی حکومت تھی -

الغرض یہ دونوں بھائی جو کہ دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالات علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے اور نیک سیرتی اور حسن اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے، شیخ سعدی کے ساتھ ان کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا اور شیخ کو بھی جیسا کہ اس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے، ان دونوں سے انتہا کے درجہ کی محبت اور الفت تھی - ظاہرا جب سے شیخ نے سفر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی اس کے تمام اخراجات اور اس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفّل خواجہ شمس الدّین اور خواجہ علاؤ الدّین تھے - ایک بار خواجہ شمس الدّین نے پانچ سو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دارالسلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے، راہ میں غلام نے شیخ کے معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھروسے پر اس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو دینار شیخ کے حوالہ کیے - شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان کے خط میں پانسو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں، اس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا - قطعہ :

خواجہ تشریفم فرستادی و مال
مالت افزوں باد و خصمت پائمال
ہر بد ینا ریت سالے عمر باد
تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

ترجمہ :- تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی - تمھاری دولت زیادہ اور تمھارے دشمن پائمال ہوں - تمھاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہوجیو، تاکہ تم ساڑھے تین سو برس دنیا میں رہو -

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبیخ کی اور رقم کی بابت تدارک مافات کر کے شیخ سے

معافی[1] چاہی - اس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں - ایک بار اس نے اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا - جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اس کے تقاضے کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا - قطعہ :

سفینہ حکمیات و نظم و نثر لطیف
کہ بارگاہ ملوک و صدور را شاید
بصدر صاحب صاحبقران فرستادم
مگر بعین عنایت قبول فرماید
سفینہ رفت و ندانم رسید یا نہ رسید
بداں دلیل کہ آیندہ دیرمی آید
بہ پارسائے ازیں حال مشورت بر دم
مگر ز خاطر من بند بستہ بکشاید
چہ گفت، گفت ندانی کہ خواجہ دریائے ست
نہ ہر سفینہ ز دریا درست باز آید

---

۱ - برمذق بخارائی جو ایک زبردست شاعر ہے ، اس کو بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے - بادشاہ نے اس کو پانسو تومان انعام میں بھیجے تھے ، مگر اس کو دو سو پہنچے - اس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا - قطعہ :—

شاہ دشمن گداز دوست نواز آن جہانگیر کو جہاندار است
بش یوز آلتون کرم نمود بمن لطف سلطان بندہ بسیار است
سہ صداز جملہ غائب است و کنوں در براتم دو صد پدیدار است
یا مگر من غلط شنود ستم یا کہ پروانہ چی طلبگار است
یا مگر در عبارت ترکی بش یوز آلتون دو یست دینار است

مگر اس قطعے میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعے کی شوخی اور لطافت نہیں ہے- بش یوز آلتون کو بش یز آلتن پڑھنا چاہیے- یہ ترکی الفاظ ہیں ، جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے -

ایک بار خواجہ علاؤ الدّین نے جلال الدّین ختنی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا ، تبریز سے یہ حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیج دو ، مگر اس وقت جلال الدّین کا انتقال ہو چکا تھا ۔ اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی ۔ جب شیخ کو اس حال کی اطلاع ہوئی تو اس نے ہنسی سے خواجہ علاؤ الدّین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا ۔

پیام صاحب دیوان علائے دولت و دیں
کہ دیں بدولت ایّام او ہمے نازد
رسید و پایۂ حرمت فزود سعدی را
بسے نماند کہ سر بر فلک بر افرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدّین
قبول حضرت او را تعہّدے سازد
ولیک برسر او خیل مرگ تاختہ بود
چناں کہ برھمہ[1] ابنائے دھرے تازد
جلال زندہ نخواھد شدن دریں دنیا
کہ بندگان خداوند گار بنوازد
طمع بریدم از و در سرائے عقبیٰ نیز
کہ از مظالم مردم بمن نہ پردازد

ترجمہ :۔ صاحب دیوان علاؤ الدین جس کے عہد دولت پر دین کو ناز ہے ، اس کی تحریر پہنچی اور سعدی کو عزت بخشی ۔ قریب تھا کہ اس کا سر آسمان تک پہنچ جائے ۔ اس میں حکم تھا کہ امیر جلال الدّین اس کے فرمان کی تعمیل کر دے ، مگر اس پر لشکر اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی ۔ جیسی

---

۱ ۔ پہلے اڈیشن میں برسر لکھا ہے مگر تیسرے اڈیشن میں خود مولانا نے اس کو برھمہ سے بدل دیا ہے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

کہ سب پر ہوا کرتی ہے ۔ اب جلال الدّین دنیا میں تو آنے والا ہی نہیں کہ خدا کے بندوں کی خبر لے ۔ میں نے آخرت میں بھی اس سے اُمید قطع کی ، کیونکہ لوگوں کے استغاثے اس کو میری طرف کاہے کو متوجہ ہونے دیں گے ۔

خواجہ علاء الدّین نے فوراً اس کی تلافی کی اور عذر چاہا ۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اب اس کی قبر ہے ، یہ بھی صاحب دیوان کے روپے سے بنی تھی ۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار دینار اس نے شیخ کو دیے تھے ۔ شیخ نے ہر چند ان کے لینے سے انکار کیا ، مگر صاحب دیوان نے بہ‌هزار منّت و ساجت اس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اس رقم سے ایک عالیشان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشۂ شمال مغرب میں شہر سے ملا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک وہیں عزلت نشین رہا ۔

شیخ سے اکثر اہل علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا ۔ ازاں جملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدّین کا جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشّاق و ماہر تھا ، نقل کیا ہے ۔ جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق ۔ چونکہ اس قطعے سے اس زمانے کے علماء کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے، اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔ قطعہ :

سالک راہ خدا پادشہ ملک سخن
اے زالفاظِ تو آفاق پر از دُرّ یتیم
اخترِ سعدی و عالم ز فروغ تو منیر
واضع عقلی و گیتی ز نظیرِ تو عقیم
پیشِ اشعارِ توشعرِ دگران راچہ محل
سحر بے وقع نماید بر اعجاز کلیم

بندہ را از توسوالے است کہ توجیہ سوال
نکنند مردم پاکیزہ سیر جُز بہ کریم
مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق
ایں در بستہ تو بکشائے کہ بابے ست عظیم
گرچہ ایں ہردو بیک شخص نیایند فرود
در دماغ و دل بیدار تو ہستند مقیم
پایۂ منصب ہر یک ز کرم باز نمائے
تا ز الفاظِ خوشت تازہ شود جان سقیم
باد آسودہ و فارغ ز بد و نیک جہاں
خاطر آئینہ کردار تو چوں نفس حکیم

شیخ نے اس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے جو اس کے کلّیات میں موجود ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا ، وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور اطاعت کرتا تھا۔ سردار انکیانو کو وہ برابر قصائد اور پند نامہ وغیرہ میں اس طرح خطاب کرتا ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں ۔ اس کے سوا ملک عادل شمس الدّین تازی گو جو کہ غالباً انکیانو کے بعد شیراز کا حاکم مقرر ہوا تھا ، وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا ۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں ، سبزی فروشوں کے ہاتھ جبراً کسی وعدہ پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دکان پر بھی جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقالی کی دکان کرتا تھا ، بھجوائے ۔ شیخ اس زمانے میں

حضرت ابو عبداللہ[1] ابن خفیف کی خانقاہ میں مجاور تھا ، اس کو بھی اس واقعے کی خبر پہنچی، اس نے ملک شمس الدّین کو جو کہ اس حال سے بے خبر تھا ، ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہل فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دکانداری اور بے نوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدّین نے فوراً اس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درہم پیش کر کے کہا یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے خرچ کے لیے ہے ، اس کو قبول کیجیے ۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی ۔

شیخ کی وفات[2] شیراز میں جب کہ اتابکان فارس کے خاندان

---

۱ - یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں ، جن کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری نے لکھا ہے کہ حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خفیف کے برابر نہیں ہیں ۔

۲ - سر گورا وسلی نے اس کی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر سلغر شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے ، مگر یہ بالکل غلط ہے ۔ اتابک محمد شاہ سنہ ۶۶۱ ہجری میں تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مر گیا ۔ پھر اس کا بھائی سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور سنہ ۶۶۲ ہجری[1] میں قتل کیا گیا ۔ پھر سعد زنگی کی بیٹی آبش خاتون کے نام کا سکہ اور خطبہ جاری ہوا اور سنہ ۶۶۷ ہجری میں اس کو معزول کر کے سلطان اباقا خاں نے سردار انکیانو کو جو شیخ کا ممدوح ہے ، حاکم فارس مقرر کیا ۔ اب آگے کوئی متنفس اتابکان فارس کے خاندان کا حکمران نہیں ہوا ۔ پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ، خاندان اتابک کے زوال کے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے ۔

---

۱ - پہلے اڈیشن میں سنہ ۶۶۲ عیسوی لکھا ہے مگر یہ کتابت کی غلطی ہے اصل سنہ ۶۶۲ ہجری ہے ۔ اسی طرح آگے چل کر سنہ ۶۶۷ھ بھی بجائے ہجری کے عیسوی لکھا ہوا ہے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایت فارس تاتار کی حکومت میں آ گئی تھی ، سنہ ۶۹۱ ھجری میں واقع ہوئی ہے - کسی شاعر نے اس کے مرنے کی تاریخ اس طرح کہی ہے -

در بحرِ معارف شیخ سعدی
کہ در دریائے معنی بود غوّاص
مہ شوّال و روزِ جمعہ رو حش
بداں درگاہ رفت از روئے اخلاص
یکے پر سید سال فوت گفتم
زخاصاں بود ازاں تاریخ شد خاص ۶۹۱ ھ

شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور اکثر نے ایک سو بیس برس لکھی ہے - ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے ، کیوں کہ شیخ جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے ، جوانی کے زمانے میں شیراز سے باہر گیا ہے اور بغداد میں اس نے مدتوں امام ابن جوزی سے علم تحصیل کیا ہے - امام ابن جوزی کی وفات سنہ ۵۹۷ ھجری میں ہو چکی تھی اور شیخ کی وفات اس سے ۹۴ برس بعد واقع ہوئی - پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اگر ایک سو دس برس کی عمر قرار دی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانے میں نکل گیا تھا - پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے، اسی طرح دوسری بات بھی خلاف واقعہ ہے -

سرگورا وسلی نے انگلستان کے ایک سیّاح ولیم فرینکلن کے سفر نامہ سے جو کہ سنہ ۱۷۸۶ء میں فارس گیا تھا ، شیخ کے مدفن کا حال لکھا ہے کہ شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک میل

جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے ۔ عمارت اس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے ، جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے ۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے ، جس میں شیخ کا اور اس کی تصنیفات کا حال درج ہے ۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے ، جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ، ڈھکی رہتی ہے اور اس پر شیخ ہی کا ایک شعر خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے ۔ جب اس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھلائی دیتا ہے ۔ اکثر اہل اسلام جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعے کے لیے ایک نسخہ شیخ کی کلّیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے ۔ مقبرے کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں ، جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں ، یہ اشعار انھوں نے لکھے ہیں ۔ شیخ کے مقبرے کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائے گی ۔ نہایت افسوس کی بات ہے اور زمانے کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اس کی مرمّت کرانے کا خیال نہیں آتا ۔ اس مقبرے کے متّصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں ، جنھوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے ''۔

اس کے بعد سرگورا وسلی صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۸۱۱ء کے شروع میں جب کہ میں جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاچار کے پاس پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا ، اس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا ۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا ۔ مسٹر فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے ۔ اس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے ۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں وہاں تھے ، ان

کا اب نام‌ونشان تک باقی نہیں رہا ۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اس مقبرے کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے ، اور میرے حسن عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا ، مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرے کی مرمت کرا دوں ۔ مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اس وقت فارس کا گورنر تھا ، اس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اپنے روپے سے مزار کی مرمت کرا دوں گا ، آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں ۔ اس نے کہا کہ میں شیخ کے مزار کی مرمت اسی اسلوب اور عمدگی سے کراؤں گا جیسے کریم خاں زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی ، لیکن افسوس ہے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا ۔

نہایت تاسّف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر جو زہد و تقویٰ اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا ، کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے ‘‘۔

سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب ، زمین کے اس کنارے کا رہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے، باوجود اختلاف مذہب ، اختلاف قوم اور اختلاف ملک کے ایک مسلمان مصنّف کی ایسی قدر کرے کہ عالم سفر میں اس کے مقبرے کی مرمت کرانے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے پر موجود ہو ، اور ایک مسلمان بادشاہزادہ سے باوجود اتّحاد زبان اتّحاد مذہب ، اتّحاد قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے ۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شہرت اس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اس کی زندگی ھی میں تمام ایران ، ترکستان ، تاتار اور ھندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اس پر مشکل سے یقین آتا ھے ۔ خود شیخ بھی گلستان کے دیباچے میں کہتا ھے ''ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ ، وصیت سخنش کہ دربسیط زمین رفتہ '' شیراز اور کاشغر میں کچھ کم سولہ سو میل کا فاصلہ ھے ۔ پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے ، وھاں کے چھوٹے بڑے اس کے کمالات سے واقف تھے ۔

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ھے ، غالباً یہ وہ زمانہ ھے کہ چنگیز خاں چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ھے اور سلطان محمد خوارزم شاہ کے ساتھ چند روز کے لیے اس کی صلح ھو گئی ھے ۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وھاں ایک

طالب علم مقدمۂ زمخشری[1] ہاتھ میں لیے زبان سے کہ رہا تھا کہ ''ضرَبَ زیدٌ عمرواً'' شیخ اس سے چھل کی باتیں کرنے لگا'' اور کہا کیوں صاحب ! خورازم و خطا میں صلح ہو گئی ، مگر زید اور عمر کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے ؟ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا ۔ فرمایا ''خاک پاک شیراز''۔ اس نے کہا ''کچھ سعدی کا کلام یاد ہے ؟'' شیخ نے بطریق مزاح اسی وقت دو عربی شعر کہ کر پڑھے ۔ اس نے کسی قدر تامّل کے بعد کہا ''سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے ، اگر کچھ اس میں سے یاد ہو تو پڑھیے''۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے ۔ شعر :

اے دل عشّاق بدام تو صید
ما بتو مشغول تو با عمرو و زید

صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا ، کسی نے اس طالب علم سے کہ دیا کہ سعدی یہی شخص ہے ۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے آپ نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گذاری سے سعادت حاصل کرتا ۔ اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجیے تو ہم لوگ خدمت گذاری سے مستفید ہوں ۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ اشعار پڑھے ۔ اشعار :

بزرگے دیدم اندر کوھسارے
قناعت کردہ از دنیا بغارے
چرا گفتم بشہر اندر نیائی
کہ بارے بند از دل بر کشائی

---

۱ - علامہ جار اللہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے ، اس کا نام مقدمۂ زمخشری ہے ۔

بگفت آنجا پری رویان نغزند
چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

اسی طرح ملتان سے جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے، دو بار خان شہید سلطان محمد قاآن نے شیخ کی شہرت سن کر اس کو وطن سے بلایا، مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آ سکا۔

تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام[1] تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے، وہ نہایت مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے، تب تک اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے، فوراً نہایت شرمندگی سے عذر معذرت کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا، کمال تعظیم اور ادب سے اس کی مہمان داری کی۔

سرگورا وسلی نے کتاب مجالس العشاق سے ایک حکایت نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم نزاری قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج کا آدمی تھا اور اسمٰعیلی مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص خراسان کا رہنے والا ہے۔ شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو خراسان میں کوئی جانتا ہے؟ کہا اس کا کلام وہاں عموماً زبان زد خلائق ہے اور پھر شیخ کی درخواست سے اس کے چند اشعار پڑھے، جن کو سن کر شیخ محفوظ ہوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھل گئی۔ شیخ،

---

۱ - خواجہ ہمام الدین باوجود نسبت باطنی اور کمالات علمی کے تبریز کے امراء میں سے تھا اور شاعری میں تمام معاصرین اس کو مانتے تھے۔ محقق طوسی سے تحصیل علم کی تھی اور ۷۱۳ ہجری میں وفات پائی۔

نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا اور بہت دنوں اس کو جانے نہ دیا اور بہت خوشی سے خوب دل کھول کر اس کی مہمان داری کی ۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اس کو دکھائیں گے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں ۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک بھی پہنچ گیا ، اس کو کمال افسوس ہوا اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمان داری میں شاید کوئی قصور دیکھا ۔ چند مدّت کے بعد حسن اتفاق سے شیخ کا گزر قہستان میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی ۔ حکیم بہت محبت اور اخلاق سے پیش آیا ، دعوت میں کچھ زیادہ تکلّف نہیں کیا ۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسمی اور سیدھا سادہ تھا ، دوسرے وقت ایک بھنے ہوئے تیتر کے سوا اور کچھ نہ تھا ، تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلا ہوا پارچہ اور خشکہ تھا ، چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلفات کیے تھے ، اس طرح سے مہمان آخر کو بار خاطر ہو جاتا ہے ، لیکن ہمارا یہ طریقہ ایسا نہیں ہے ۔ شیخ کو اس جملے کا مطلب جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا ، اب معلوم ہوا ۔

اس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعصّبات سے مبرّا تھا ۔ فرقہ اسمٰعیلیہ کے لوگ اس زمانے میں عموماً ملحد اور بے دین سمجھے جاتے تھے اور کوئی فرقہ مسلمانوں کے نزدیک اسمٰعیلیوں سے زیادہ مبغوض اور مردود نہ تھا ۔ پس شیخ کی کمال بے تعصّبی تھی کہ اس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمٰعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر خاطر اور مدارات کی اور خراسان میں خود اس سے جا کر ملا اور اس کا مہمان رہا ۔

الغرض یه حال شیخ کی شہرت کا خود اس کے زمانے میں تھا اور اس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اس کے کلام نے حاصل کی ، اس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں -

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرأ نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں ، جن سے ان کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے - مولانا عبدالرّحمٰن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعه نقل کیا ہے ، جس میں فردوسی کو مثنوی کا ، انوری کو قصیدے کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے اور وہ قطعه یہ ہے - قطعه :

در شعر سه کس پیمبر انند
هر چند که لا نبی بعدی
ابیات و قصیدهٔ و غزل را
فردوسی[1] و انوری[2] و سعدی[3]

نیز مولانا جامی نے نفحات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرت تصانیف اور جامعیت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار قبولیت کلام کے امیر پر اس پیرایے میں ترجیح دی ہے که امیر نے بھی خضر[4] کی ملاقات کے وقت یه درخواست کی تھی که اپنا آب دہن اس کے منه میں ڈالے - خضر[4] نے فرمایا که یه دولت سعدی کے نصیب کی تھی -

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہمام تبریزی کو اپنی مثنوی نه سپہر میں غزل کا استاد مانا ہے ،

لیکن دیگر اصناف سخن میں کنایۃً اپنے کو ترجیح دی ہے، مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر خود فخر کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔ شعر :

خسرو سر مست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از میخانۂ مستے کہ در شیراز بود

حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس زمانے کے اہل مذاق سعدیٔ ہندوستان کہتے تھے، شیخ کے تتّبع پر افتخار کیا ہے، وہ کہتے ہیں ۔ شعر :

حسن گلے ز گلستان سعدی آوردہ است
کہ اہل معنی گلچیں ازیں گلستان اند

خواجہ مجد الدّین ہمگر جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے، اس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہلاکو خاں کے رکن سلطنت بھی تھے، یعنی خواجہ شمس الدّین صاحب دیوان، امیر معین الدّین پروانہ حاکم روم، ملک افتخار الدّین کرمانی اور ملا نور الدّین رصدی نے باتفاق ہم‌دگر ایک قطعہ مرتب کر کے مجد ہمگر کے پاس بھیجا تھا، جس میں امامی، ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی ۔ اس کے جواب میں مجد ہمگر نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی تھی ۔ رباعی :

اگرچہ[1] بہ نُطق طُوطی خوش نفسیم
بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم

---

۱ ۔ شیخ نے بھی اس رباعی کو سن کر ایک رباعی لکھی ہے، جو اس کی کلیات میں موجود ہے یعنی
ہر کس کہ بپارگاہ سامی نرسد   از بخت سیاہ و بد کلامی نرسد
ہمگر کہ بعمر خود نہ کردہ است نماز   شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

در شیوهٔ شاعری به اجماع اُمم
هرگز من و سعدی به امامی نه رسیم

اس رباعی میں اگرچه همگر نے شیخ کو اپنے سے بهتر بتایا هے ، مگر امامی کو اپنے اور شیخ دونوں پر ترجیح دی هے ۔

حاجی لطف علی خاں آذر نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا هے وہ ملاحظه کے قابل هے ، وہ لکھتا هے که بعض مدّعیان شعر نے مجدالدّین همگر سے که به عنایت الٰهی پستی طبع میں آج ان کا کوئی نظیر نہیں هے ، سعدی اور امامی کی بابت محاکمه چاها تها ۔ انهوں نے جواب میں یه رباعی تحریر فرمائی ۔ میں نے اس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا که همارے زمانے میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں هے (جیسا که محاکمه چاهنے والوں کو تها) اهل مذاق جانتے هیں که همگر کی تحقیق کیسی پهسڈی هے ۔ هاں انهوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا هے که میں امامی کے درجے کو نہیں پهنچتا ، بے شک امامی کا مرتبه جناب صاحب رباعی سے بهت بالا تر هے ، لیکن کسی طرح اس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں هے ۔ بلکه تین[1] شخصوں کے سوا اور کسی کی مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے ۔ میں اکثر یه سوچا کرتا تها که جیسا همارا زمانه دانش مندوں پر سخت گزرتا هے ، ایسا زمانه پهلے سخن وروں پر بهی گزرا هے یا نہیں ۔ جب یه حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آ گیا"۔ حاجی موصوف نے اس مقام پر مجد همگر کی شان میں ایک قطعه بهی لکها هے اور وہ یه هے ۔ قطعه :

یکے گفت ، امامی امام هری را
ز سعدی فزوں یافته مجدِ همگر

---

۱ - شاید تین شخصوں سے مراد فردوسی ، انوری اور نظامی هیں ۔

درین ماجرا چیست رائے تو ، گفتم
ستمگر بود مجد همگر ستمگر

ہمارے نزدیک اگر مجد ہمگر اس عصر میں جس میں سعدی اور امامی گزرے ہیں نہ ہوتا ، بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اس کو بھی شیخ اور امامی کے رتبہ میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا۔ معاصرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں ، مگر جس قدر ان کا زمانہ گزرتا گیا ، اسی قدر وہ پردے مرتفع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہو گئی ۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانے میں دو اہل کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے ، کیوں کہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور ان دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور ان مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں ۔ اور اس طرح سے بڑھتے بڑھتے دو بڑے بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں ۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور ان کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا ، تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے ۔ شیخ اور امامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطراف عالم میں پھیل جائے گا ، اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائے گا ۔

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے ۔ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں ۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے ، جو جناب الٰہی میں مقبول ہوئی ، یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے ۔ بیت :

برگِ درختانِ سبز در نظر هوشیار
هر ورقے دفترے ست معرفت کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عزلت خانہ پر یہ مژدہ سنانے کے لیے گئے - وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں - شاید اس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو، لیکن ہم کو اس میں کوئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی - خوابوں کا سچّا ہونا اور ان میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلّم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے - اس کے علاوہ ہم اس حکایت سے ہر حال میں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے -

اس حکایت کو اور زیادہ چمکانے کے لیے شیخ ابو الفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے - یعنی یہ کہ فیضی نے نلدمن کی توحید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا - شعر :

در ہر بُنِ مُو کہ مے نہی گوش
فوارہ فیضِ اوست در جوش

تو اس نے بھی ویسے ہی صلے کی توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا، آسمان کی طرف منہ کیا - اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے پیخال کی جو فیضی کے منہ پر آ کر پڑی - وہ بہت جھنجھلایا اور کہا ''شعر فہمیٔ عالم بالا معلوم شد''- ظاہرا یہ مضمون عبدالقادر بدایونی کا جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا سخت دشمن ہے، گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر[1] اخیر کا فقرہ ایسا گرم ہے کہ مولوی صاحب کے

---

۱ - اس پیرے کا یہ آخری فقرہ پہلے اڈیشن میں ہے مگر بعد کے کسی اڈیشن میں نہیں - (اسماعیل پانی پتی)

چہرے پر ہرگز نہیں کھلتا ۔

" چمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر هوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے ۔ چوں کہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی ، اس لیے ظن غالب ہے کہ وہ هوریس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا "۔

ہم نہیں کہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے اور واقعے میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں ۔ ظاهرا یہ ویسا ہی قیاس ہے کہ جیسا کہ دلّی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضۂ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں ۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت پستی کی حالت میں ہوتی ہے ، اگرچہ وہ کسی زمانے میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو ، جس طرح اس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر و ذلیل اور ہیچ و پوچ معلوم ہوتی ہیں ، اسی طرح ان کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے ۔ اور اگر ان کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اس کو مجبوراً کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے ۔

سر ولیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے ، اس نے جو شیخ اور اس کے کلام کی بابت لکھا ہے ، وہ سر گورا وسلی نے نقل کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ سعدی نے تیرھویں صدی میں جب کہ اتابکان فارس وہاں کے اهل کمال کو تقویت دے رہے تھے ، اپنے جوهر دکھانے شروع کیے تھے ۔ حالانکہ اس کی تقریباً تمام زندگی سفر میں گزری تھی ۔ باوجود اس کے کسی ایسے شخص نے بھی جس کو عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا "۔

انگلستان کے بعض مصنّفوں نے اس کو ایسٹرن شیکسپئر یعنی مشرقی شیکسپئر کہا ہے ۔ اگرچہ یہ تشبیہ ان مشرقی شاعروں کی

نظر میں جو شیکسپئر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں، کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی ، لیکن جب کہ یہ بات مسلّم ہے کہ انگریز شیکسپئر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں ، تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرق کا شیکسپئر کہتے ہیں ، انھوں نے کس درجے کا شاعر تسلیم کیا ہے ۔

شیکسپئر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادات کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے ، بلکہ ہمیشہ نیچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں ۔ دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ ، صاف ، اور دل نشیں ہوتا ہے ۔ اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت و پند پر رکھی ہے ۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھلّم کھلّا نصیحت کرتا ہے اور شیکسپئر کے پلے (یعنی ناٹک) سن کر کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ میرے ہم جنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں ، یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے مگر اس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے ۔ بلکہ یہ گیتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے ، نیز دونوں کا کلام مقبول اور دلنشین ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے ۔ جس طرح شیکسپئر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ، اسیٔ طرح شیخ کی گلستاں اور بوستاں کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اردو میں ضرب المثل ہیں اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حسن اور یہ بات کہ انھوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور ان کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ، ثابت ہوتی ہے ۔ اگرچہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی

ہے کہ ایشیا میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم و تعلّم کا چرچا ہے اور کسی کتاب کا نہیں ہے اور اسی طرح یورپ میں جس قدر شیکسپئر کا کلام دائر و سائر ہے ، ایسا اور کسی شاعر کا کلام نہیں - پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں ، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہ مقبول اور دل نشین ہونے کے قابل نہ ہو ، کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح تمام ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے -

۷ - کلیات شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم ، نثر ، فارسی اور عربی جو اس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی ابن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے ، حسب تفصیل ذیل ہے :

۱ - نثر میں چند مختصر رسالے (جن میں سلوک اور تصوّف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور سلوک و حکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) - ۲ - گلستان - ۳ - بوستان - ۴ - پند نامہ (جس کو عرف عام میں کریما کہتے ہیں) ۵ - قصائد فارسی (جن میں مراثیے ، ملمّعات ، مثلّثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں) ۶ - قصائد عربیہ - ۷ - غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیّبات - ۸ - دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع - ۹ - تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم - ۱۰ - غزلیات قدیم جو غالباً عنفوان شباب کی لکھی ہوئی ہیں - ۱۱ - مجموعہ موسوم بہ صاحبیّہ جس میں شیخ نے قطعات ، مثنویات ، رباعیات اور مفردات کو خواجہ شمس الدّین صاحب دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے - ۱۲ مطائبات و ہزلیات -

ان تمام کتابوں اور رسالوں میں سے مثنوی پند نامہ یعنی "کریما" کو بعض اہل مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیوں کہ اوّل تو کلّیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مثنوی نہین دیکھی گئی، دوسرے شیخ کے عام کلام میں جو پختگی اور جزالت یا دلفریبی اور جادو پایا جاتا ہے، اس سے یہ مثنوی معرّا ہے، مگر ہمارے نزدیک اس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردّد کی بات نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ بوستاں اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا حال بالکل اس شعر کا مصداق ہے۔ شعر:

گہے بر طارم اعلیٰ نشینیم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینیم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہذیان اور یہی وہ خاصیت ہے جو بشر کے کلام کو خدا کے کلام سے جدا کرتی ہے۔
کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَلَوْکَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِاللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافاً کَثِیْراً
کلّیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جانا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے، ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اس نے اس کو بھی کلّیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلّیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو۔ بہر حال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں دیکھتے اسی طرح اس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے۔

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں، متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کرے گی، ہم ان کی حقیقت ظاہر

کرنے کی کوشش کریں گے ۔ ناظرین با تمکین سے یہ درخواست ھے کہ اگر کہیں ھماری رائے کی غلطی ظاھر ھو تو اس کو متعصّبانہ افراط و تفریط پر محمول نہ فرمائیں بلکہ اس کو ایک مقتضائے بشریت سمجھ کر اسی قدر مواخذے کے قابل ٹھہرائیں جس قدر کہ ایک غلط مگر سچی رائے پر مواخذہ ھو سکتا ھے ۔

گلستان اور بوستان

اگرچہ ہر تصنیف و تالیف کی ماہیت اور ان کے عیب اور خوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اس پر ریویو لکھنا اور اس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے۔ جس طرح بدیہیات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے، اسی طرح ایسی مقبول اور مسلّم کتابوں کے محاسن بیان کرنے مشکل ہیں، اور اسی طرح ان پر نکتہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمّے لیتے ہیں اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بین لوگوں پر چھوڑتے ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے، ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور بڑھاپے تک ان کے مطالعے کا شوق باقی رہتا ہے۔ لاکھوں استادوں نے انہیں پڑھایا اور کروڑوں شاگردوں نے ان کو پڑھا۔ ان کے بے شمار نسخے خوش نویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا ایڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، مشائخ اور علما نے ان کی عزت کی، بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا کا دستورالعمل بنایا، منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت

کے آگے سر جھکایا اور ان کے تتبّع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔ ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت و بلاغت، تہذیب اخلاق، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے، بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ''احد هما افضل من الآخر'' لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دی جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔

فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں، بلکہ مثنوی معنوی اور شاهنامہ نے شاید اس سے بھی بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے، لیکن فارسی نثر میں ظاهرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سر گورا وسلی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ''سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل اجنٹیس نے لاطینی میں کیا تھا، اس نے مدتوں یورپ کے اهل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

تذکرۂ مجمع الفصحا میں جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہوا ہے، لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں، ایسی اور کوئی کتاب نہیں ہوئی۔ شاهنامہ، مثنوی معنوی، گلستاں اور دیوان حافظ''۔

هندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں جیسی ایران میں، مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں، اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بےساختگی میں چاروں کتابیں کم وبیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس

کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی ، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو ، کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلّف اور تصنّع سے بالکل پاک ہیں ، ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا ۔

ہماری رائے میں گلستان کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں ۔ سب سے اول شاھنامہ پر غور کرو ، قطع نظر اس کے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاھوں کے محاربات انسان کو همیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں ۔ جس زمانے میں کہ شاھنامہ لکھا گیا ، اس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکر کشی و کشور کشائی کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا اور شجاعت و بہادری کے مضمون ان کو دل سے پسند آتے تھے ۔ پس ایک رزمیہ نظم کا ، جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ، ایسے وقت میں لکھا جانا ان کی حالت کے نہایت مناسب تھا ۔ یہی سبب تھا کہ شاھنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی صدھا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھیں اور آخر کو اس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ بادشاھوں کے ھاں شاھنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے اور قہوہ خانوں میں جا بجا گرمئی صحبت کے لیے شاھنامہ پڑھا جاتا تھا ۔ اس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب قصے ، جیسے سیمرغ کا زال کو پرورش کرنا ، طہمورث دیوبند کا دیووں کو قید کرنا ، جام جمشید کے کرشمے ، رستم کا اپنے زور سے تنگ آ کر اس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا ، اس کا سیکڑوں دیووں

کو مارنا اور مغلوب کرنا ، اس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا ، دژ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصۂ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے اس میں درج تھے ، جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں ۔ ان باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا ۔

مولانا روم کی مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوّف اور معرفت کا تسلّط روز بروز بڑھتا جاتا تھا ۔ شیخ محی الدّین ابن العربی ، شیخ صدر الدّین قونوی ، شیخ شہاب الدّین سہروردی ، شیخ علاؤ الدّولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوّف کی روح پھونک رہی تھیں ۔ شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ دل لبھانے لگے تھے ۔ شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متنبّی اور ابو تمام کی تشبیہیں بے مزہ معلوم ہونے لگی تھیں ۔ حدیقہ اور منطق الطیر نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا ، ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوّف اور حقائق سے بھری ہوئی ہے ، مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا جیسے غزنویہ اور سلاجقہ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویّہ کے عہد میں حملۂ حیدری کا ۔ اس کے سوا مثنوی میں بھی صدہا عجیب و غریب قصّے اور فوق العادۃ نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور ان میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے ۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوّف کے علاوہ قصّے کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی ۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں "نیست پیغمبر و لے دارد کتاب" اور مثنوی کے حق میں "ہشت قرآن در زبان پہلوی" کہا گیا ہے ۔

کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی ، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو ، کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلّف اور تصنّع سے بالکل پا ک ہیں ، ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا -

سبب ہماری رائے میں گلستان کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں - سب سے اول شاھنامہ پر غور کرو ، قطع نظر اس کے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاھوں کے محاربات انسان کو ھمیشہ بالطبع مرغوب ھوتے ھیں - جس زمانے میں کہ شاھنامہ لکھا گیا ، اس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکر کشی و کشور کشائی کا شوق حد سے بڑھا ھوا تھا اور شجاعت و بہادری کے مضمون ان کو دل سے پسند آتے تھے - پس ایک رزمیہ نظم کا ، جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ھیں ، ایسے وقت میں لکھا جانا ان کی حالت کے نہایت مناسب تھا - یہی سبب تھا کہ شاھنامہ ختم ھونے سے پہلے ھی اس کی صدھا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ھو گئی تھیں اور آخر کو اس کا یہاں تک رواج ھو گیا تھا کہ بادشاھوں کے ھاں شاھنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے اور قہوہ خانوں میں جا بجا گرمئی صحبت کے لیے شاھنامہ پڑھا جاتا تھا - اس کے سوا ھزاروں عجیب و غریب قصے ، جیسے سیمرغ کا زال کو پرورش کرنا ، طہمورث دیوبند کا دیووں کو قید کرنا ، جام جمشید کے کرشمے ، رستم کا اپنے زور سے تنگ آ کر اس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا ، اس کا سیکڑوں دیووں

کو مارنا اور مغلوب کرنا ، اس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا ، دژ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصۂ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے اس میں درج تھے ، جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں ۔ ان باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا ۔

مولانا روم کی مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوّف اور معرفت کا تسلّط روز بروز بڑھتا جاتا تھا ۔ شیخ محی الدّین ابن العربی ، شیخ صدر الدّین قونوی ، شیخ شہاب الدّین سہروردی ، شیخ علاؤ الدّولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوّف کی روح پھونک رہی تھیں ۔ شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ دل لبھانے لگے تھے ۔ شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متنبّی اور ابو تمام کی تشبیہیں بے مزہ معلوم ہونے لگی تھیں ۔ حدیقہ اور منطق الطیر نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا ، ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوّف اور حقائق سے بھری ہوئی ہے ، مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا جیسے غزنویہ اور سلاجقہ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویّہ کے عہد میں حملۂ حیدری کا ۔ اس کے سوا مثنوی میں بھی صدہا عجیب و غریب قصّے اور فوق العادۃ نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور ان میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے ۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوّف کے علاوہ قصّے کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی ۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں ''نیست پیغمبر و لے دارد کتاب'' اور مثنوی کے حق میں ''ہشت قرآن در زبان پہلوی'' کہا گیا ہے ۔

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین کے سوا جو کہ دنیا میں ہمیشہ مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزور اپنی طرف کھینچتے ہیں اور کوئی مضمون ہی نہ تھا اور اس خیال نے کہ اس میں عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرائے میں ادا کی گئی ہین، اس کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور دل رُبا کر دیا تھا۔ پس ان تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔

گلستان میں ان وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ تھی۔ نہ اس میں رزم تھی، نہ عجیب و غریب افسانے تھے، نہ فوق العادۃ قصے، نہ حقائق و معارف، نہ شریعت کے اسرار، نہ طریقت کے نکات، نہ غزل عاشقانہ، نہ قول عارفانہ، بلکہ اس کی بنیاد محض اخلاق پند و موعظت پر رکھی گئی تھی، جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاص کر فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ پند و موعظت جب تک قصے یا ناٹک کے پیرائے میں نہ ادا کی جائے اکثر مخاطب کی وحشت اور تنفر کا باعث ہوتی ہے، کیوں کہ انسان کی طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متنفر اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ پس گلستان کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ اس کی فصاحت و بلاغت اور حسن بیان اور لطف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لاجواب تسلیم کیا جائے اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا۔

گلستان کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے، فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ زمانے میں گلستان کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول

اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے کہ اس زمانے کے فضلا اور ادبا اس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زور طبع اور قدرت نظم عربی دکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیب نامدار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانے میں تھا، اپنی مشہور تاریخ وصّاف میں گلستان کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعۂ سعدی

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویزِ تومستم
بگفتا من گلے نا چیز بودم
و لیکن مُدتے با گل نشستم
جمالِ همنشیں در من اثر کرد
وگر نہ من هماں خاکم کہ هستم

ترجمہ عربیّہ

اذا هو فی الحمّام طین مطیّب تو صّل من ایدی کریم الیٰ یدی
فقلت له هل انت مسک و عنبر فانّی من ریّاک سکران معتد
اجاب بانّی کنت طیناً مذ للاً فجا لست للورد الجنیّ بمعهد
فاثّر فی خلقی کمال مجالسی والاّ انا التّرب الّذی کنت فی ید

قطعۂ سعدی

گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند
تا دلِ خویش نیاز ارد و در هم نشود

سنگ بدگوہر اگر کاسۂ زریں بشکست
قیمت سنگ نیفزاید و زر کم نشود

ترجمۂ عربیّہ

ان نال ندّ من الا نذال منقصةً حاشی له ان یذیب النّفس بالضجر
فالتبر من حَجَر اذصار منکسراً فالتبّر تبرٌ و مایزداد فی الحجر

پھر ایک مدت کے بعد گلستان کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہوا ، جو کئی صدیوں تک عرب ، شام ، روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے ، اس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے ۔ اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اس کے متعدد ترجمے سنے گئے ہیں ، جن کا مفصّل حال معلوم نہیں ہے ۔ یورپ میں گلستان اور بوستان کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے ، مگر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور ایڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سنہ ۱۸۵۲ء تک چھپے اور شائع ہوئے ۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ۔

گلستاں کے ترجمے بوستاں کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں ، سب سے پہلے اجنٹیس نے اصل گلستاں مع لاطینی ترجمہ اور کسی قدر حواشی کے ایمسٹرڈم میں چھپوائی ، پھر ڈورائر نے جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کونسل تھا ، فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا ، جو سنہ ۱۶۳۴ء میں بمقام پیرس چھپا ۔ اس کے بعد اصل کتاب سے گاڈین نے سنہ ۱۷۸۹ء میں اور سیمالیٹ نے سنہ ۱۸۳۴ء میں ترجمہ کیا ۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرنچ میں ہوئے تھے ۔ جرمن زبان میں آولی ایریس کا ترجمہ زیادہ مشہور ہے ، وہ اس کے دیباچے

میں لکھتا ہے کہ اس ترجمے میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمے سے پہلے ڈورائر کے فرنچ ترجمے سے ایک اور ترجمہ جرمن میں ہو چکا تھا۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اول۔ سنہ ۱۶۵۴ء میں بمقام سلیزوگ چھپا تھا اور اسی سال جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر ایمسٹرڈم میں چھپا۔ اولی ایریس نے بوستاں کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستاں کا ایک اور ترجمہ ایچ۔ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو سنہ ۱۸۴۶ء میں بمقام لیپزک چھپا ہے۔ اسی مترجم نے بوستاں کا بھی ترجمہ کیا ہے جس کا نام لسٹ گارٹن ہے جو سنہ ۱۸۵۰ء میں دو جلدوں میں چھپا ہے۔ انگریزی میں گلستاں کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو بمقام لندن سنہ ۱۸۰۸ء میں چھپا۔ دوسرا ترجمہ راس صاحب کا ہے جو ایشیا ٹک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا۔ ایک اور ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے، نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں۔ جو سنہ ۱۸۵۲ء میں بمقام ھرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔

سعدی کے کلّیات فارسی و عربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ھیرنگٹن نے سنہ ۱۷۹۱ء میں چھپوائے تھے اور گلیڈون نے صرف گلستاں سنہ ۱۸۰۶ء میں چھپوائی جو دوبارہ سنہ ۱۸۰۹ء میں بمقام لندن مطبوع ہوئی۔ پھر سنہ ۱۸۰۷ء میں جس ڈیمولن نے گلستاں مع اپنے ترجمے کے کلکتہ میں چھپوائی جو کہ اس وقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چکی ہے۔ پروفیسر فاکز [1] نے فارسی خواں طلبا کے لیے بوستاں کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے، جس میں تقریباً تہائی کتاب داخل ہے اور بعض حکایات کے ترجمے

---

۱ - بعد کے اڈیشنوں میں یہ نام فاکر لکھا ہوا ہے۔ (اسماعیل پانی پتی)

حواشی سمیت ایشیاٹک جرنل میں مع متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اے اسپرنگر نے سنہ ۱۸۵۱ء میں بمقام کلکتہ گلستاں مع اعراب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی اور ایسٹوک نے بمقام ہرٹ فورڈ سنہ ۱۸۵۰ء میں اس کو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے مع فرہنگ کے شائع کیا۔

مذکورۂ بالا ترجموں اور اڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کیا گیا ہے اور بھی بہت سے ترجمے اور اڈیشن خصوصاً سنہ ۱۸۵۲ء کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ ازاں جملہ سنہ ۱۸۷۱ء میں جان پلیٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسطہ نے اصل گلستاں مع انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی اور کپتان دلبر فورس کلارک نے بوستاں کا انگریزی ترجمہ سنہ ۱۸۷۹ء میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اس نسخے سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورنٹیل سوسائٹی میں سنہ ۱۸۵۱ء میں چھپا تھا۔ پھر حال ہی میں بوستاں کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکنن نے نظم میں کیا ہے، جس کا نام ''فلوزر فروم دی بوستاں'' رکھا ہے۔

ہندوستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستاں کا ترجمہ ہوا ہے۔ ازاں جملہ میر شیر علی افسوس تخلص نے مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اس کا اردو ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں لکھا ہے مگر چونکہ اس وقت تک اردو زبان خوب منجھ کر صاف نہ ہوئی تھی اس لیے زمانہ حال کے ترجمے جو اس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور با محاورہ اور فصیح ہیں۔ بنگالی اور گجراتی میں بھی گلستاں کے ترجمے ہوئے ہیں مگر ان کا مفصل حال معلوم نہیں ہے۔ بھاشا میں اول شمال مغربی اضلاع میں گلستاں کے آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا، جس کی اشاعت کو تقریباً تیس برس گزرے ہوں گے، اس ترجمے کا نام مترجم نے ''پشپوپ باٹکا''

(یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ھے ۔ اس کے بعد ھارے دوست پنڈت مہر چند داس مہاجن اگروال جینی مذھب متوطن قصبہ سونی پت ضلع دھلی نے حال ھی میں ساری گلستان کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ھے ، جو اب تک شائع نہیں ھوا ۔ اس ترجمے کا نام پشپوپ بن رکھا ھے جو کہ لفظ گلستاں کا مرادف ھے ۔ پنڈت صاحب نے پند نامۂ شیخ یعنی کریما کا بھی بھاشا ترجمہ چوپائی وزن کی نظم میں لکھا ھے ، جس کا نام سیکشا پنتری ھے ۔ × شاید[1] نامناسب نہ ھوگا اگر پشپوپ بن میں سے چند فقرات اور ابیات کا ترجمہ مع اصل کے اس مقام پر بطور نمونہ نقل کیا جائے ۔

علم چندانکہ بیشتر خوانی — پڑھ کتنے ھی شاستر گوڈ[2]
چوں عمل در تو نیست نادانی — جو آچرن نہیں ھے موڈ
نہ محقق بود نہ دانشمند — کھوجی ھوئے نہ اور دھیان
چار پائے بروکتا بے چند — پیٹھ چتشپد لدے پران
آں تہی مغز را چہ علم و خبر — وہ جڑ بدھ کرت نہیں درشٹ
کہ بر او ہیزم ست یا دفتر — لکڑی دا پستنگ مم پرشٹ

خواھندۂ مغربی در صف بزازان — ایک پشچمی[3] بھکشک حلب نگر
حلب میگفت اے خداوندان نعمت — کے کپڑا بیچنے والوں کی منڈلی

۱ ۔ گلستاں کے بھاشا ترجمے کے متعلق یہاں سے آخر تک کی عبارت ھے مع حواشی کے پہلے اڈیشن میں ھے مگر بعد کے کسی اڈیشن میں نہیں پائی جاتی ۔ ھم نے پہلے اڈیشن کی اس عبارت کے اول و آخر میں کانٹی (×) کا نشان لگا دیا ھے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

۲ ۔ × گوڈ ، دقیق ۔ آچرن ، عمل ۔ موڈ ، احمق ۔ کھوجی ، محقق ۔ دھیان ، عقلمند ۔ چتشپد ، چوپایا ۔ جڑھ بدھ ، احمق ۔ درشٹ ، دیکھنا ۔ دا ، حرف تردید یعنی یا ۔ پستک ، کتاب ۔ مم ، میری ۔ پرشٹ ، پشت ۔

۳ ۔ پشچمی ، پچھم کا رھنے والا ۔ بھکشک ، بھکاری ۔ منڈلی ، مجمع ۔

اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت ، رسم سوال از جہاں برخاستے۔

میں کہتا تھا بھودر بیّا دھیشوید تمھارے میں نیائے ہوتا اور ہمارے سنتوش تو مانگنے کی ریت جگت سے اٹھ جاتی ۔

اے قناعت تو نگرم گرداں
کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست
کنج صبر اختیار لقمان ست
ہر کرا صبر نیست حکمت نیست

ہے سنتوش مجھے دھنوان
کہ تجھ بن سمپت نہیں آن
یہ سنتوش کوش سکھراس
ہے لکمان چتر کے پاس
جا کے من سنتوش نہ ہوے
پنڈتتا دھورے نہیں سوئے

دو کس رنج بیہودہ بردند و سعی بے فائدہ کردند ، یکے آنکہ اندوخت و نخورد ، دیگر آنکہ اموخت و نکرد ۔

دو منشوں نے نرر تھک کلیش کیا اور برتھا پریشرم اٹھایا ۔ ایک وہ جس نے سنچے کیا اور نہ بھوگا ، دوسرا وہ جس نے پڑھا اور نہ گنا ۔ ×

ترجموں کے علاوہ گلستاں بلکہ بوستاں کی بھی بہت شرحیں اور فرہنگیں لکھی گئی ہیں ، جن میں سے خان آرزو کی خیابان گلستاں اور ٹیک چند کی بہار بوستاں زیادہ مشہور ہیں ۔ علی الخصوص گلستاں کی قدر و منزلت ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے ۔ جس طرح

بھو ، حرف ندا ۔ دربیا دھیش ، دولتمند ۔ ید ، اگر ۔ سنتوش ، صبر ۔ دھنوان ، دولتمند ۔ سمپت ، دولت یا نعمت ۔ کوش ، خزانہ ۔ سکھراس ، راحت ۔ لکمان ، لقمان ۔ چتر ، دانشمند ۔ من ، دل ۔ پنڈتتا ، فضیلت ۔ دھورے ، قریب ۔ سوئے ، اس کے ۔ منش ، آدمی ۔ نرر تھک ، بے فائدہ ۔ کلیش ، تکلیف ۔ برتھا ، بے فائدہ ۔ پریشرم ، کوشش ۔ سنچے کرنا ، جمع کرنا ۔ بھوگنا ، کھانا ۔ گننا ، عمل کرنا ۔ ×

اہل علم نے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں ، یا اہل تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اس پر رکھی ہے یا منشیوں نے اس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے ، اسی طرح امراء نے اس کے نسخے نہایت خوشخط لکھوا لکھوا کر ان کو مطلّا اور مُذہّب کرایا ہے ۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کے رئیسوں نے بھی جو درس و کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے ، اس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے ۔ بعضوں نے ایک ایک نسخے کی تیاری اور تزیین میں لاکھ لاکھ روپے کے قریب صرف کیا ہے ۔ اگرچہ ان باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے ، لیکن گلستاں کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کے رئیس اس کو اس قدر عزیز رکھیں ۔ گویا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اس وقت کرتا ہے کہ ایک اناڑیوں کی مجلس میں جا پھنسے اور ان کو محفوظ کر کے اٹھے ۔

گلستاں کے ابواب کی عمدہ ترتیب ، اس کے فقروں کی برجستگی ، اس کے الفاظ کی شستگی ، اس کے استعارات کی جزالت ، اس کی تمثیلات و تشبیہات کی طرفگی اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتدبہ حصہ اس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اس کی تنقیح و تہذیب میں اپنے فکر اور سلیقے سے پورا پورا کام لیا تھا ۔ چنانچہ دیباچۂ گلستاں کے اخیر میں اس نے صاف کہا ہے کہ ’’برخے از عمر گرانمایہ برو خرج کردیم‘‘۔ مگر دیباچے ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصل بہار کے آغاز میں اس کا لکھنا شروع ہوا تھا ، وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہو گئی اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستاں چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی ، مگر یہ بالکل غلط ہے ۔ جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں ،

وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خون جگر کی چاشنی نہ ہو ۔ اور جس قدر اس میں صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے، اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اس کی درستی اور کانٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی ۔ یورپ میں اکثر نامی مصنفوں کے مسودے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں ۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصے میں جو فریرا ایک بستی ہے وہاں مشہور مصنف ایرسٹو کے مسودے اب تک موجود ہیں ۔ اس مصنف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلفی میں مشہور ہے مگر اس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹے گئے ہیں ۔ لارڈ میکالے جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنف ہے اس کا ایک مسودہ لندن میوزیم میں رکھا ہے، اس میں جا بجا کاٹ پھانس اور حک و اصلاح پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں ۔ ظاہرا شیخ نے جو گلستاں کے دیباچے میں فصل بہار کا ذکر کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ گلستاں کے لیے جو سرمایہ اس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا وہ پہلے سے اس کے پاس نا مرتب موجود تھا ۔ جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اس کو مرتب کر دیا ۔ یہ ترتیب فصل بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی ۔ گلستاں اور نیز بوستاں کی ترتیب جس سلیقے سے شیخ نے کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اس کام میں بہت دقت اٹھانی پڑی ہوگی ۔ اس نے ان کتابوں میں زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو خود اس پر گزرے ہیں یا اس کے سامنے پیش آئے اور ہر ایک باب کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں ۔ اس تمام مجموعے کو گلستاں میں آٹھ باب پر اور بوستاں میں دس باب پر تقسیم کیا ہے ۔

اور ہر ایک باب میں اس کے مناسب حکایتیں درج ہیں اور ظاہرا علم اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے، جو بقدر ضرورت ان میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو - یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص اپنی سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اس میں علم اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدر ضرورت آ جائے - اس ترتیب کی قدر اس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نا مرتب کر کے گڈ مڈ کر دیا جائے اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجے شیخ نے استخراج کیے ہیں وہ ان میں درج نہ کیے جائیں اور پھر تمام مجموعۂ حکایات کو جدا جدا بابوں میں تقسیم کرایا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے -

جس طرح ہر ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی ہے اسی طرح ایران میں بھی اول شاعری کا ظہور ہوا تھا اور دوسری صدی کے اخیر سے جب کہ اول ہی اول خواجہ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا، کئی صدیوں تک مقتضائےوقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی رہی - فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدت کے بعد شروع ہو گیا - لیکن شیخ کے زمانے تک اس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی - اکثر سیدھی سادی عبارت عام روز مرہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہل علم کسی قدر خواص کے روز مرہ میں تحریر کرتے تھے - چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ جو کہ پانچویں صدی (ہجری) میں لکھا گیا، اس میں نہایت بے تکلفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں اور بعض ادیب اور فاضل جن پر عربیت غالب تھی، ان کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر عربی لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراوش کرتے تھے، مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اس

کے فقروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور تول کا لحاظ رکھنا جاری نہ ہوا تھا ۔ خصوصاً کوئی اخلاق کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانے تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی ، جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامری کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ سنہ ۱۰۰۵ھ[1] میں قاضی حمید الدّین ابوبکر نے مقامات بدیعی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقامات حمیدی لکھی ہے ، اس میں نہایت تکلف اور تصنّع پایا جاتا ہے ۔ اس کی بنیاد زیادہ تر صنائع لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیعی اور حریری کی طرح مقفّیٰ اور مسجّع لکھی ہے اور جس طرح ان دونوں کتابوں میں فرضی قصّے وضع کیے گئے ہیں اسی طرح اس میں بھی محض خیالی افسانے لکھے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر قسم کے تصرّف کرنے کا اختیار مصنف کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا اور تجنیس و ترصیع اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قدرت رکھتا تھا ۔

ایک اور کتاب موسوم بہ ''قابوس نامہ'' پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر سے گزری ہے ، جس کا مصنف قابوس[2] بن سکندر ملقّب بہ عنصرالمعالی ہے ، یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے ۔ اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے اور مضامین عمدہ ہیں ، لیکن اس کے سوا کوئی لذّت یا دلفریبی اس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی ۔

---

۱ - یہاں اصل کتاب میں ''عیسوی'' کا لفظ لکھا ہوا ہے جو کتابت کی غلطی ہے - (اسماعیل پانی پتی)

۲ - یہ شخص دیالمۂ آل زیاد میں سے ایک بادشاہ ہے ، جس نے جرجان اور گیلان وغیرہ میں اکیس برس حکمرانی کی ہے اور ۴٦۲ ہجری میں وفات پائی ۔

غرضیکہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستاں کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہوگی ۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اس روش کا موجد تھا اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو گیا ۔

اس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف عام ایرانی نثّاروں کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی یا اپنا تفلسف اور تبحر علمی جتانا یا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لبھانا اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا ۔ اس نے دونوں کتابوں میں باستثناء چند حکایتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو ۔ وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کان سے سنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں ۔ عام حکایتیں جو ان دونوں کتابوں میں درج ہیں ، وہ اس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بدمعاش سائل نے اپنے کو قرض دار ظاہر کر کے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے ، لوگوں نے کہا یہ تو مکار تھا ، اس کو کچھ نہیں دینا چاہیے تھا ۔ فرمایا اگر مکار تھا تو میں اس کے شر سے بچا ورنہ وہ اوروں کے شر سے بچا ۔

یا یہ کہ ایک بادشاہ زادہ کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر پڑا ، بادشاہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ ۔ یا یہ کہ میں چند درویشوں کے ساتھ روم میں پہنچا اور ہم سب ایک ذی مقدور شیخ کے ہاں آترے ، اس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا ۔

ان سیدھی سادی حکایتوں کو ایسے لطیف اسلوب سے بیان

کرتا ہے اور ان سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا دلچسپ قصّہ معلوم ہوتا ہے۔

گلستان اور بوستان کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے، یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ ان کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا، اس میں کوئی نہ کوئی لطیف اور چبھتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور یا یہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسن بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا افتادہ مضمون کو بھی اسی قدر دل آویز طور پر بیان کر سکتا تھا جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو۔

تعجب ہے کہ شیخ کی گلستان جو آئندہ نسلوں کے لیے نثر فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی، ایران میں اس کے تتّبع کا کسی نے خیال نہیں کیا، یا یوں کہیے کہ کسی سے اس کا تتّبع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم و فضل شیخ سے بمراتب فائق تر تھا، مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی۔ ایران میں سب سے بڑا نثّار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانے میں ہوا ہے۔ اس کی مشہور کتاب تاریخ وصاف سے بے شک اس کا کمال علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجے کی استعداد کا آدمی ڈکشنری کھولے بغیر سمجھ سکے، یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر چُبھے۔ سنہ ۷۱۲ ہجری میں جب کہ سلطان محمد اولجائتو خاں خدا بندہ کے حکم سے آذر بیجان میں

شہرسلطانیہ بن کر تیار ہوچکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی ۔ اس تقریب میں فضل اللہ بھی موجود تھا اور اسی زمانے میں اس نے تاریخ وصّاف ختم کی تھی ۔ اس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی ، سلطان نے اس میں سے متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا ۔ اس وقت دربار میں وزیر رشیدالدّین اور قاضی القضاۃ ، نظام الدّین عبدالملک اور خواجہ اصیل الدّین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور فاضل موجود تھے ۔ فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے کہ ان سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی ، خاص سلطان کے سنانے کو لکھے تھے ، وہ پڑھنے شروع کیے ۔ سلطان ہر فقرے کے معنی رشید الدّین و غیرہم سے پوچھتا تھا ، یہ لوگ اس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے ، تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا ، یا شرمے شرمائے کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا ۔ یہ حال تاریخ وصّاف کی عبارت کا ہے ، اس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اسی بات میں کوشش کی ہے کہ ان کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور ان کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو ، مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات ، زود فہم الفاظ اور دلاویز عبارت میں ادا کیے جائیں ۔

تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جو شیخ کے بعد گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہیں ۔ ایک مولانا عبدالرحمٰن جامی کی بہارستان ، دوسری مجد الدّین[1] خوافی کی خارستان ، تیسری

---

۱ - یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا ۔ خواف خراسان میں ایک مشہور بستی ہے ، کہتے ہیں کہ خارستان اس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی ۔

حبیب[1] قاآنی شیرازی کی پریشان - سو اول ہم بہارستان اور خارستان کا ذکر کرتے ہیں - اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو خارستان کا طریقہ تحریر اکثر جگہ اہل زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب دونوں کو گلستان کے مقابلے میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو جاتی ہے ، اسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک کو دوسری سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی - حکایتیں اور روایتیں جو ان دونوں کتابوں میں درج کی گئی ہیں ، وہ فی الحقیقت گلستان کی حکایتوں سے بہت ملتی جلتی ہیں اور زیادہ تر مجد الدّین خوافی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اسی طریقے پر مرتب کیے ہیں مگر شیخ کے حسن بیان اور لطف ادا سے گلستان نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے ، جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے - ہر چند اس قسم کی ہم شکل اور ہم جنس کتابوں میں پورا پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے ممکن نہیں ہے ، لیکن چند متّحد المضمون فقروں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلاویز ہے اور کون سا کم - اس لیے چند ایسی مثالیں جو نہایت دقّت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں اس مقام پر نقل کی جاتی ہیں -

---

[1] - یہ شخص زمانۂ حال کا ایک نہایت مسلم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہل ایران خاتم الشعراء سمجھتے ہیں - اس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گزرے -

گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

گلستان

اسکندر را پرسیدند کہ دیار مشرق و مغرب را بچہ گرفتی کہ ملوک پیشیں را خزائن و عمر و ملک و لشکر بیشں از تو بود و چنیں فتحے میسّر نشد ۔ گفت بعون خدائے عزّ و جلّ ہر مملکتے را کہ گرفتم رعیتش را نیازردم و رسوم خیرات گزشتگان باطل نکردم و نام بادشاہاں جز بہ نکوئی نہ بردم ۔

بیت

بزرگش نخوانند اہل خرد کہ نام بزرگاں بزشتی برد

قطعہ

ایں ہمہ ہیچ ست چوں می بگزرد بخت و تخت و امر و نہی و گیرو دار
نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت بر قرار

بہارستان

اسکندر را گفتند بچہ سبب یافتی انچہ یافتی از دولت و سلطنت و مملکت با صغرسن و حداثت عہد ۔ گفت بہ استمالت دشمناں تا از غائلۂ دشمنی زمام تافتند و از تعاہد دوستاں تا در قاعدۂ دوستی استحکام یافتند ۔

بیت

بایدت ملک سکندر چوں وے از حسن سیر
دشمناں را دوست گرداں دوستاں را دوست‌تر

ان دونوں عبارتوں میں بہ اعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اس کا فیصلہ زیادہ تر ذوق صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قید بیان میں آ سکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے ، لیکن اس سے محض

گلستان کی فوقیت جتانی مقصود ہے ، نہ کہ بہارستان کی تنقیص کرنی ۔

اول ۔ ''اسکندر را پرسیدند'' اور ''اسکندر را گفتند'' میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے ۔ سوال کے موقعہ پر پرسیدن بہ نسبت گفتن کے زیادہ مناسب ہے ۔

دوسرے ۔ شیخ کے ہاں خزائن و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت دونوں ورنہ صرف لفظ مملکت حشو ہے اور صغر سن کے بعد حداثت عہد بھی حشو ہے ۔

تیسرے ۔ شیخ کے بیان میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے ، کیوں کہ باجود کمئی لشکر و ملک و عمر کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا اور مولانا کے ہاں سوال کی وجہ ایسی ظاہر نہیں ہے کیوں کہ تھوڑی سی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے ۔

چوتھے ۔ اسکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اس میں ہرگز اس سے زیادہ اختصار کی گنجائش نہ تھی ، ورنہ سکندر کا جواب ناتمام رہتا اور جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے وہ ان لفظوں میں ادا ہو سکتا تھا ''بہ استمالت دشمنان و تعاہد دوستاں'' اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضروت معلوم نہیں ہوتی ۔

پانچویں ۔ شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے وہ کئی وجہ سے مولانا کے نتیجے کی نسبت زیادہ بلیغ ہے ۔ شیخ کا نتیجہ لازمی ہے اور مولانا کا نتیجہ غیر لازمی ، کیوں کہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنا لے گا ، اس کو ضرور سکندر جیسی

سلطنت حاصل ہو جائے گی ۔ اس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا ، بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جائے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کر سکتا ۔ نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے کیوں کہ سلف کی تعظیم اور ادب اور ان کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں مثمر برکات ہے اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطین اولوالعزم کے ساتھ مخصوص ہے ، کیوں کہ ملک سکندر کی خواہش ان کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی ۔

گلستان

رازیکه نهان خواهی با کس درمیان منه ، اگرچه دوست باشد که مرآن دوست را نیز دوستان باشند و هم چنیں مسلسل ۔

قطعه

خامشی به که ضمیر دل خویش　　با کسے گفتن و گفتن که مگوے
اے سلیم آب ز سر چشمه به بند　　که چو پرشد نتوان بستن جوے

بیت

سخنے در خلا نباید گفت　　کاں سخن برملا نشاید گفت

بهارستان

اسرار نهان خود را با هیچ دوستے درمیاں منه ، زیرا که بسیار بود که در دوستی خلل افتد و به دشمنی بدل گردد ۔

قطعه

اے پسر سرّے کش از دشمن نهفتن لازم ست
به که از افشائے آں با دوستے کم دم زنی

دیدہ ام بسیار کز سیر سپہر کج نہاد
دوستاں دشمن شوند و دوستیہا دشمنی

قطعہ

بر سرّ سر بمہر کہ افتد بخاطرت
سرعت مکن بہ موج بیانش نگاشتن
ترسم شود غرامت اظہار آں ترا
مشکل تر از ندامت پوشیدہ داشتن

اس مثال میں بھی گلستان کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ بلیغ ھے -

۱ - شیخ کہتا ھے ''رازیکہ نہاں خواھی'' یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ھو آسے کسی سے نہ کہو - اور مولانا کہتے ھیں ''اسرار نہاں خود را '' یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاھر نہ کرو - حالانکہ بعض بھید کیسے ھی پوشیدہ ھوں ، ایک مدت کے بعد کہنے کے لائق ھو جاتے ھیں ، مگر جن کا چھپانا منظور ھوتا ھے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ھوتے -

۲ - شیخ کہتا ھے ''با کس درمیان منہ اگرچہ دوست باشد'' اور مولانا کہتے ھیں ''با ھیچ دوستے درمیان منہ ''- پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست سب سے راز کہنے کی ممانعت ھے ، مگر دوسرا بیان جب تک اس طرح نہ ھو ''با دوست ھم درمیان منہ '' تب تک اس میں تعمیم پیدا نہیں ھوتی -

۳ - شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ھے کہ اس کے دوست بھی ھوں گے اور ان دوستوں کے بھی دوست ھوں گے ، اور یہ سلسلہ اسی طرح چلا جائے گا ، پس چپکے ھی چپکے راز جمہور میں پھیل جائے گا - مولانا نے یہ وجہ بیان کی ھے کہ شاید

دوستی میں خلل آ جائے اور دوست دشمن ہو جائے ۔ اگرچہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلی وجہ زیادہ موّجہ ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آ جانا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ۔

۴ ۔ شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعے سے بمراتب افضل اور فائق تر ہے ۔ پہلی بیت میں اس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی ہے ۔ وہ کہتا ہے ''خامشی بہ کہ ضمیر دل خویش ۔ با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے ''۔ یعنی کسی سے اپنا بھید کہ کر اس کو افشائے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے ، کیوں کہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے، اس لیے اب اس کو ضبط راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا ۔ پس اس سے خاموشی ہی بہتر ہے ۔ دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو خاطر خواہ دل نشین کیا ہے ۔ مولانا کے قطعے میں کوئی خوبی اس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے، اسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے مگر ساتھ ہی افشا کا لفظ زائد معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ''ازاں دم نہ زنی'' کی جگہ ''از افشائے آں دم نہ زنی'' کہا گیا ہے ''۔ اور قطعہ کا اخیر مصرع بھی حشو یا تکرار سے خالی نہیں ہے ، دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانا فی الحقیقت ایک ہی بات ہے ۔

۵ ۔ قطعے کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے ، جو فی الواقعہ سہل و ممتنع ہے، یعنی ''سخنے در خلا نباید گفت''۔ کاں سخن برملا نشاید گفت ۔ یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا تو نا گفتی باتیں کہنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تخلیے میں گفتگو کر رہے ہیں اس سے اغیار مطلع نہیں ہو سکتے، حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ

منتشر ہو جاتی ہیں ۔ اس مجّرب اور سچے مضمون کو جو کسی قدر دقیق بھی تھا ، ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں ۔ پھر خلا اور ملا اور در اور بر کا مقابلہ اور صنعت ذوقافیتین اس کے علاوہ ہے ۔ مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی ، مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی ”ہر سِرّ سر بمہر کہ افتد بخاطرت الخ“ اس میں پہلے مصرع سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو راز سربستہ تیرے خیال یا دل میں گزرے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو ، پھر ”بموج بیانش نگاشتن“ کا لفظ ”در اظہار آں“ کی جگہ لایا گیا ہے ، جس میں نہایت تکلف ہے، پھر اخیرمصرع میں ندامت کا لفظ شاید بے محل ہے ، کیونکہ اخفائے راز سے کبھی ندامت نہیں ہوتی ۔ باوجود ان تمام باتوں کے دونوں مثالوں میں شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ بمقابلۂ گلستاں کے الفاظ کے غریب معلوم ہوتے ہیں ، جیسے وراثت عہد ، غائلہ ، تعاہد ، بموج بیانش نگاشتن ، غرامت ۔

گلستان اور خارستان کا مقابلہ

گلستاں	خارستان
حکیماں دیر دیر خورند و عابداں نیم سیر ، و زاہداں تاسدّ رمق و جواناں تاطبق برگیرند و پیراں تا عرق کنند ۔ امّا قلندراں چنداں خورند کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر سفرہ روزی کس ۔	ہر کہ در گرسنگی طاقت نیارد باید کہ سہ یک شکم را از طعام پر کند و سہ یک دیگر از آب و سہ یک دیگر ازبرائے نفس زدن رہا کند۔ امّا صوفیان وقت ما میگویند کہ تو ہمہ شکم را از

گلستان	خارستان
بیت اسیر بندشکم را دوشب نگیرد خواب شبے ز معدهٔ سنگی شبے ز دل تنگی گلستان عالم ناپرهیزگار کورمشعله دارست یُهدی به و هو لا یهتدی بیت بیفائده هر که عمر درباخت چیزے نخرید و زر بینداخت	طعام پرکن ۔ آب خود چیز لطیف است خود را جائے میکند که لطیفاں را جائے کم نباشد و نفس را جائے گو مباش ۔ بیت بشنو که چه گفت صوفی پرواری چوں سیر شدی چرا غم جان داری خارستان علم با عمل همچو طعام بانمک ست هر کرا هردو هست حکمتے تمام دارد و طعام بے نمک را چه تواں کرد بیت عمل بے علم نامضبوط باشد همیشه شرط با مشروط باشد

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے ، بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خارستان کی عبارت گلستان کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور بے وقعت ہے ۔ اسی لیے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے ۔

پریشان کا مصنّف مرزا حبیب قاآنی کتاب مذکور کے خاتمے کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اس کی عمر تیس برس سے بھی

دو تین برس کم تھی جب یہ کتاب اس نے لکھی ہے اور شیخ نے گلستاں کو سن کہولت اور اوائل سن شیخوخت میں مرتب کیا ہے - پس اگر قاآنی سے گلستاں کا پورا پورا تتبع نہ ہو سکا ہو تو کچھ تعجب نہیں ، کیونکہ ایسی کتاب کا سر انجام کرنا جس کی بناء محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہیے، شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان نا تجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا ، بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قاآنی سے گلستاں کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا ، کیوں کہ اس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے ، جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشنے کے سوا حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی - پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی جاتی تھی ، اسی قدر بیان حقائق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اس سے سلب ہوتا جاتا تھا - قاآنی نے بھی گلستاں کی طرح پریشاں کی عبارت دلچسپ اور دلاویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے ، مگر سوا اس کے کہ تمام کتاب کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند آزاد اور بے باک نوجوانوں کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کر دیا اور کچھ اس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمۂ کتاب کے سوا جس میں اس نے ابنائے ملوک کے لیے پند پند کر کے نصیحتیں لکھی ہیں ، تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اکثر نہایت غلیظ ، فحش یا سخیف ہزل پر رکھتا ہے، جس کے پڑھنے سے شرم آتی ہے - اور طرہ یہ کہ پھر اس سے نتائج عارفانہ اور متصوفانہ استخراج کرتا ہے - یہی سبب ہے کہ پریشان کا خاتمہ جس میں شوخی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے ، باب ہشتم گلستاں کے مقابلے میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے - تمام خاتمے میں شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بے شک عمدہ ہے مگر شیخ کی جادو بیانی کا کہیں نشان نہیں پایا جاتا - عام نصائح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اس قبیل کی ہیں :

"پند ۔ پادشاہ باید بسخنِ سخن چینان اعتماد نکند ۔

پند ۔ پادشاہ باید دین را توقیر کند و دشمنانِ دین را تحقیر فرماید ۔

پند ۔ پادشاہ باید از خدا غافل نماند تا خدائے از و غافل نباشد ۔

پند ۔ پادشاہان را در نظام ممالک دستِ دُر افشان بکارست و تیغ سر افشان ۔

بیت

تا کہ بدان دوستاں شوند فراهم   تا کہ بدیں دشمناں شوند پریشاں

اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے ، وہاں حقیقت سے دور جا پڑتا ہے ۔ مثلاً :

"پند ۔ پادشاہ باید تواضع کند و تکبّر نفرماید کہ تواضع صفت اتقیاست و تکبّر صفت اشقیا ۔ و من گفتہ ام اهل تکبر را در نطفہ غش ست چہ سرکشی صفت آتش ست و شیطان از آتش بود و اهل تواضع را نطفہ پاکست چہ افتادگی صفت خاک ست و آدم از خاک بود "۔

اس پند کے پہلے حصّے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصّے میں جو اس نے کچھ ندرت پیدا کرنی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہو سکا ۔ اسی مضمون کو شیخ نے بوستاں میں اس طرح بیان کیا ہے :-

ز خاک آفریدت خداوند پاک   پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

حریص وجہاں سوز وسرکش مباش   ز خاک آفریدندت آتش مباش

چو گردن کشید آتش هولناک   بہ بیچارگی تن بیفند اخت خاک

چو آں سرفرازی نمود این کمی   ازاں دیو کردند ازیں آدمی

البتہ جو عذر کہ قاآنی نے پریشان کے دیباچے میں کیا ہے اور گلستاں کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عجز ظاہر کیا ہے، اس سے اس کا نہایت انصاف اور گلستاں کی قدر شناسی ثابت ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے احباب کے نہایت سخت جبر سے پریشان کے لکھنے پر قدم اٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستان کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ میں نے کہا بھائی! توبہ کر، میں اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے کذّاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا۔ میں نے مانا کہ جگنو رات کو چمکتا ہے لیکن کیا وہ چاند کی برابری کر سکتا ہے؟ شیخ کی گلستاں ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتّی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہل معنی کی جان قیامت تک اس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم و نثر اور جدّد ہزل ترتیب دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کر سکتی، لیکن اس کو بھی چار و ناچار اڑنا ہی پڑتا ہے''۔

اب ہم چند ایسے فقرے گلستاں اور پریشان سے انتخاب کر کے لکھتے ہیں جو متّحد المضمون ہیں۔

گلستان اور پریشان کا مقابلہ

گلستان

اے فرزند دخل آبِ روان ست و خرج آسیائے گرداں۔ یعنی خرج فراواں کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد۔

قطعه

چو دخلت نیست خرج آهسته تر کن که میگو یند ملاّحان سرودے
اگر باران به کوهستان نبارد بسالے دجله گردد خشک رودے

پریشان

دخل سر چشمه ست و مخارج جوئے چند که آب سر چشمہ در انہار جاری است ۔ ولا شک چوں سرچشمه مسدود شود ، جوئہا خشک شود ۔ پس هر کس آب در جو جاری خواهد سر چشمه را رعایت کند ۔

ایضاً

خرج به اندازۂ دخل باید کرد نه آں که خرج معلوم باشد و دخل موهوم ۔ چه ایں معنی بغایت نا معقول ست که بار در پیش قدم و بار گیر در حیّز عدم باشد ۔

قطعه

الا اے آنکه خرجت هست موجود بکارت سے نیاید دخل معدوم
شنیدستی کسے از بہر جولاں نشیند بر فرازِ اسپِ موهوم

اس مثال میں گلستاں سے صرف ایک عبارت اور پریشان کے دو مختلف مقامات سے دو عبارتیں ایک هی مضمون کی نقل کی گئی هیں ، مگر شیخ کا بیان قاآنی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ بلیغ هے ۔ لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک هیں ان کا بیان کرنا اول تو مشکل هے ، دوسرے یه امید نہیں که ناظرین اس کو غور سے دیکھیں گے ، اسی لیے صرف ایسے فرق بتائے جاتے هیں جو زیادہ روشن اور صاف هیں ۔ شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین مقتضائے مقام هے ۔ ایک تو اظہار شفقت جو ناصح کے لیے ضرور هے ، دوسرے یه جتانا که نوجوان هی اکثر اس نصیحت کے محتاج هوتے هیں ۔ پھر دخل و خرج کی

تشبیہ آب رواں اور پن چکی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر نرالی ہے اسی قدر جچی تلی بھی ہے ۔ پن چکی بھی بدوں آب رواں کے نہیں چلتی اور خرچ بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا ۔ پن چکی بھی پانی بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے چلائی جاتی ہے تو اس کی گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے ۔ خرچ بھی جو بدون آمدنی کے اندوختہ وغیرہ سے چلتا ہے ، بے بنیاد اور نا پائدار ہوتا ہے ۔ پھر اس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لیے لکھا ہے ، شیخ نے ان مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے ۔ یعنی ''خرج فراواں کردن مسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد'' اس کے بعد قطعے میں ایک نہایت بدیہی مثال دے کر بے بنیاد خرچ کا مآل ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہےاور اس مقولے کو ملّاحوں کی طرف منسوب کر کے یہ جتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملّاحی گیتوں میں گائی جاتی ہے ۔ قاآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو ندیوں سے تشبیہ دی ہے ۔ تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے، مگر یہ شیخ کی اس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اس نے قطعے میں بیان کی ہے ، لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اس کو ملّاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قاآنی کو یہ بات نہیں سوجھی ۔ پھر قاآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سر چشمہ کے بند ہوتے ہی ندیاں خشک ہو جاتی ہیں اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقع ایسا ہی ہوتا ہے ، جیسا شیخ نے لکھا ہے۔ پھرشیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساکِ باراں کی طرف مستند کیا ہے اور یہ کہا ہے ''اگر باراں بکوهستاں نبارد'' اور قاآنی کہتا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رہنا چاہے وہ سر چشمہ کی خبر رکھے ، یعنی اس کو بند نہ ہونے دے ، حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے ۔ پھر قاآنی نے تمثیل سے نتیجہ

یہ نکالا ھے کہ جو شخص ندی کا جاری رھنا چاھے وہ سر چشمہ کی خبر رکھے - اگرچہ مطلب اس سے بھی مفہوم ھو جاتا ھے ، لیکن اس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اس کو یہ کہنا چاھیے تھا کہ جو شخص ھمیشہ اپنا خرچ جاری رکھنا چاھے ، اس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاھیے ، کیوں کہ تمثیل اسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ھے ، نہ اس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رھنا چاھو تو سر چشمہ کی خبر رکھو - دوسری عبارت کو قاآنی نے اس جملے سے شروع کیا ھے ''خرج بہ اندازۂ دخل باید کرد'' اس کے بعد کہتا ھے ''نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موھوم'' یہ دوسرا جملہ اس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں ، بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ھے ، کیوں کہ سنا گیا ھے کہ وہ اکثر جشن و عید وغیرہ کے موقعوں پر دخل موھوم یعنی قصائد کے صلہ کی توقع پر قرض لے کر خرچ کر لیا کرتا تھا، ورنہ مقتضائے مقام یہ ھونا چاھیے تھا ''نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار'' یا ''نہ آنکہ دخل پنج باشد و خرج دہ'' یا اور اسی مضمون کا کوئی جملہ ھوتا ، کیوں کہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم مخالف یہی مضمون ھو سکتا ھے - اس کے سوا وہ مضمون فی نفسہ صحیح بھی نہیں ھے ، کیوں کہ دخل موھوم کی امید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ھے - تمام تاجر اور کاشتکار اور مدّبران ملک دخل موھوم ھی کے بھروسے پر لکھوکھا روپے خرچ کرتے ھیں - پھر ایسے خرچ کو جو دخل موھوم کی امید پر کیا جائے ، موھوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ھونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ھوتی - معدوم گھوڑے پر بے شک کوئی سوار نہیں ھو سکتا ، لیکن دخل موھوم کی امید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، ھزاروں آدمی خرچ کر سکتے ھیں اور کرتے ھیں -

گلستان

خشم بیش از حد گرفتن وحشت آرد و لطف بے وقت هیبت ببرد ۔ نه چندان درشتی کن که از تو سیر گردند و نه چندان نرمی که بر تو دلیر ۔

ابیات

درشتی و نرمی بهم در به ست چورگ زن که جراح و مرهم نه ست
درشتی نه گیرد خرد مند پیش نه سستی که زائل کند قدرخویش

نظم

جوانے با پدر گفت اے خرد مند مرا تعلیم کن پیرا نه یک پند
بگفتا نیک مردی کن نه چندان که گردد چیره گرگ تیز دندان

پریشان

کسانیکه ظرافت و شوخی بسیار کنند یا بغایت رقیق القلب و وسیع الخُلق باشند سرداری و سالاری لشکر را نشایند ۔ چه این صفات موجب جسارت لشکریان شود و گاه باشد که هر چه گوید به ظرافت و شوخی حمل کنند و نیز اندک مهربانی و وسعت خُلق لازم ست که لشکریان را بیم خستن و بستن نباشد ۔ دور نیست که از بیم چشم و گوش حقوق نعمت بادشاه فراموش کنند و در مخالفت هم زبان شوند و در وقت کار سستی کنند تا کار فاسد شود ۔

مثنوی

کسے را که شد حکمراں بر سپاه دو خصلت همےداشت باید نگاه
عتابے نهاں اندر و صد خطاب خطابے نهاں اندر و صد عتاب
بهر نوش او نیش‌ها جانگداز بهر نیش او نوشها دلنواز
بیک دست شمشیر زهراب دار بیک دست دریائے گوهر نثار

اس مثال میں گلستان اور پریشان کے مضمون میں کسی قدر

فرق ہے ۔ گلستان میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے اور
پریشان میں لشکر کے افسروں اور سپہ سالاروں کی تخصیص ہے ،
اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن چونکہ نفس مضمون
متحد ہے ، اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں ۔
شیخ کا بیان لفظاً و معناً قاآنی کے بیان سے بمراتب فائق‌تر ہے ۔ اول
تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول ہے جو
قاآنی کے فقروں میں نہیں ہے ۔ نثر میں ایسا تناسب بشرطیکہ معنی
مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے ، پرلے درجے کا
کمال انشا پر دازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ رتبے کی شاعری ہے ۔ شیخ
کے چاروں فقروں میں الفاظ متقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں
کہ معنی مقصود کو ان سے اور زیادہ رونق ہو گئی ہے ۔ یعنی
خشم اور لطف ، بیش از حد اور بے وقت ، وحشت اور ہیبت ،
آرد اور ببرد ، درشتی اور نرمی، از تو اور بر تو ، سیر اور دلیر ،
پھر نظم کی پہلی بیت میں درشتی اور نرمی کو جو فصّاد کی حالت
سے تمثیل دی ہے وہ کیسی بلیغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں
میں ادا کی گئی ہے اور دوسری بیت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں
میں بیان کیا ہے ، یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شعار بنا لینا اور
کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ پیش گرفتن سے مستفاد ہوتا
ہے ، اچھا نہیں ہے ، کیوں کہ عقل‌مند ایسا نہیں کرتے اور
بالکل نرمی ہی نرمی برتنا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ
سستی کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھا نہیں ہے کیوں کہ
اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے ۔ پھر دوسری نظم
میں صرف اتنی سی بات کو کہ نیکی بے محل نہیں کرنی چاہیے ،
چار مصرعوں میں فرضی سوال و جواب کے طور پر نہایت لطف کے
ساتھ بیان کیا ہے ۔ خصوصاً چنداں کا قافیہ متناسب اور ہم وزن
لانے کے لیے کس مطلب کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے ۔ قاآنی
کی نثر میں بمقابلۂ شیخ کی نثر کے کوئی خوبی جو قابل ذکر ہو

نہیں پائی جاتی اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے ۔ چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق بیّن معلوم ہوتا ہے اس لیے پریشان کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔

اب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستان کے ذاتی محاسن کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں ۔ اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابل لحاظ ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر گلستان کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے ۔ ان میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔

۱ - ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر ست ۔
۲ - ہر کہ آمد عمارت نو ساخت ۔
۳ - حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را ۔
۴ - ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر ۔
۵ - ہر کہ دست از جاں بشوید ہر چہ در دل دارد بگوید ۔
۶ - دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند ۔
۷ - سر چشمہ شاید گرفتن بمیل چو پرشد نشاید گزشتن بہ پیل
۸ - پرتو نیکاں نگیرد ہر کہ بنیادش بدست ۔
۹ - افعی را کشتن وبچّہاش را نگاہ داشتن کار خرد منداں نیست ۔
۱۰ - پسر نوح بابداں بنشست خاندان نبوتش گم شد ۔
۱۱ - دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد ۔
۱۲ - عاقبت گرگ زادہ گرگ شود ۔
۱۳ - در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس ۔
۱۴ - تونگری بہ دل ست نہ بمال و بزرگی بعقل ست نہ بہ سال ۔
۱۵ - دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست ۔

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ان کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا ، لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستان کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں سادہ رخوں اور امردوں کی طرف اس کو میلان خاطر رہا ہے ، مگر اس بات کو میں کسی بُرے معنی پر محمول نہیں کرتا ۔ صوفیہ کے حالات جو نفحات وغیرہ میں لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو، سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقی باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عرفا میں یہ خصلت پاک دامنی اور عفّت کے ساتھ دیکھی گئی ہے ۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے اسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ پر اپنی برأت بھی کی ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے :—

گر نظر صدق را نام گنہ می نہند
حاصلِ ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

(پہلے اڈیشن کے سرورق کے آخری صفحے پر
مولانا حالی کے اعلان کی پوری نقل)

اعلان

اس کتاب کی رجسٹری حسب ضابطہ ہو گئی ہے
مصنف کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے

اشتہار - مفصلۂ ذیل کتابیں راقم کے پاس موجود ہیں - جو صاحب کوئی کتاب منگانی چاہیں قیمت مندرجہ ذیل بذریعہ منی آرڈر پوسٹل نوٹ راقم کے پاس بھیج کر طلب فرمائیں - اگر کوئی صاحب دس روپے یا اس سے زیادہ کی کتابیں فروخت کے لیے خریدیں اُن کو مناسب کمیشن پر دی جا سکتی ہیں -

---

کتاب	قیمت
(۱) مسدّس مدّ و جزرِ اسلام جس میں ضمیمۂ مسدّس اور فرہنگ شامل ہے۔	کاغذ قسم اول۔ بارہ آ قسم دوم - آٹھ آ
(۲) حیاتِ سعدی ، جس میں شیخؒ کی سوانح عمری اور اُس کی تصنیفات پر ریویو بہت شرح و بسط سے لکھا گیا ہے -	سوا روپیہ
(۳) سفر نامۂ حکیم ناصر خسرو مع سوانح عمری حکیم مرتبہ راقم ، بہ زبان فارسی	کاغذ قسم اول۔ یک روپ قسم دوم - بارہ آ
(۴) مثنوی مناجاتِ بیوہ	ڈھائی آنے

المشتہر

خاکسار الطاف حسین حالی ، مقیم دھلی ، کوچۂ پنڈت -

۱۶ - حسود را چه کنم کوزخود برنج درست ـ
۱۷ - قدر عافیت کسے داند که به مصیبتے گرفتار آید ـ
۱۸ - آنانکه غنی تر اند محتاج تر اند ـ
۱۹ - چوعضوے بدرد آورد روزگار . دگر عضوها را نماند قرار
۲۰ - دامن از کجا آرم که جامه ندارم ـ
۲۱ - گاهے به سلامے برنجند و گاهے به دشنامے خلعت دهند ـ
۲۲ - هر کجا چشمهٔ بود شیریں . مردم و مرغ و مور گرد آیند
۲۳ - راستی موجب رضائے خدا ست
کس ندیدم که گم شد از ره راست
۲۴ - آن را که حساب پاک ست از محاسبه چه باک ـ
۲۵ - تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامهٔ ناپاک گاذران بر سنگ
۲۶ - تاتریاق از عراق آورده شود مارگزیده مرده شود ـ
۲۷ - به دریا در منافع بے شمار ست
وگر خواهی سلامت بر کنار ست
۲۸ - دوست آن باشد که گیرد دستِ دوست ،
در پریشان حالی و در ماندگی
۲۹ - درِ میر و وزیر و سلطان را . بے وسیلت مگرد پیراهن
سگ ودربان چویافتند غریب . ایں گریبان گرفت وآں دامن
۳۰ - خدائے را ست مسلّم بزرگی و الطاف
که جرم بیند و نان بر قرار میدارد
۳۱ - بنیادِ ظلم اول در جهان اندک بود
هر که آمد برآن مزید کرد تابدیں غایت رسید
۳۲ - هر که بافولاد بازو پنجه کرد . ساعد سیمین خود را رنجه کرد
۳۳ - چو کردی با کلوخ انداز پیکار . سر خود را بنا دانی شکستی
چو سنگ انداختی بر روئے دشمن
حذر کن کاندر آماجش نشستی

۳۴ - کس نیاموخت علم تیراز من   که مرا عاقبت نشانه نه کرد
۳۵ - دریاب کنوں که نعمتت هست بدست
کایں دولت و ملک میرود دست بدست ۔
۳۶ - گر وزیر از خدا بترسیدے ۔ هم چناں کز ملک ملک بودے
۳۷ - بر گردن او بماند و برما گذشت ۔
۳۸ - اگر شه روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماه و پرویں
۳۹ - جہاندیده بسیار گوید دردغ ۔
۴۰ - چو کارے بے فضول من بر آید ۔ مرادر وے سخن گفتن نشاید
۴۱ - اگر روزی بدانش بر فزودے ۔ زناداں تنگ تر روزی نبودے
۴۲ - محتسب را درون خانه چه کار ۔
۴۳ - هر که عیب دگراں پشیں تو آورد و شمرد
بے گماں عیب تو پشیں دگراں خواهد برد
۴۴ - یار شاطرم نه بار خاطر ۔
۴۵ - چواز قومے یکے بیدانشی کرد   نه که را منزلت ماند نه مه را
۴۶ - من آنم که من دانم ۔
۴۷ - گہے بر طارم اعلیٰ نشینیم ۔ گہے برپشت پائے خود نه بینیم
۴۸ - فہم سخن گرنکند مستمع ۔ قوت طبع از متکلّم مجوے
۴۹ - خانه دوستاں بروب و در دشمناں مکوب ۔
۵۰ - درویش صفت باش و کلاه تتری دارا ۔
۵۱ - نیک باشی و بدت گوید خلق
به که بد باشی و نیکت گویند
۵۲ - اگر دنیا نباشد درد مندم ۔ وگر باشد بمہرش پائے بندم
۵۳ - درویش هر کجا که شب آمد سرائے اوست ۔
۵۴ - پائے در زنجیر پیش دوستاں ۔ به که بابیگانگاں در بوستاں
۵۵ - زن بد در سرائے مرد نکو   همدریں عالم ست دوزخ او
۵۶ - کوفته را ناں تہی کوفته است ۔

۵۷ - او خویشتن گم است کرا رهبری کند ـ
۵۸ - باطل ست آنچه مُدعی گوید ـ
۵۹ - مرد باید که گیرد اندر گوش ۔ ور نوشته ست پند بر دیوار
۶۰ - خاک شو پیش از آنکه خاک شوی ـ
۶۱ - اگر خاکی نباشد آدمی نیست ـ
۶۲ - همره اگر شتاب کند همرهِ تو نیست ـ
۶۳ - خوئے بد در طبیعتے که نشست ۔ نرود جز بوقت مرگ از دست
۶۴ - حقّا که باعقوبت دوزخ برابر است
رفتن به پائمردیٔ همسایه در بهشت
۶۵ - خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست
تو معتقد که زیستن از بهرِ خوردن ست
۶۶ - نه چندان بخور کز دهانت بر آید
نه چندانکه از ضعف جانت بر آید
۶۷ - عطائے او به لقائے او بخشیدم ـ
۶۸ - هر که نان از عملِ خویش خورد ۔ منّتِ حاتم طائی نه برد
۶۹ - گربۂ مسکین اگر پر داشتے
تخم کنجشک از جهاں برداشتے
۷۰ - مور هماں به که نبا شد پرش ـ
۷۱ - گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاک گور
۷۲ - مُنعم بکوه و دشت و بیاباں غریب نیست ـ
۷۳ - شاهد آنجا که رود عزت و حرمت بینند
ور برانند بقهرش پدر و مادر خویش
۷۴ - به از روئے زیبا ست آواز خوش
که ایں حظِّ نفس ست و آں قوتِ روح
۷۵ - رزق هر چند بے گماں برسد
شرطِ عقل ست جستن از درها

۷۶ - بد و زد طمع دیدۂ هوشمند ۔

۷۷ - مور چگاں را چو بود اتفاق
شیرِ ژیاں را بد رانند پوست

۷۸ - صیّاد نه هر بار شکارے به برد
باشد که یکے روز پلنگش بدرد

۷۹ - گاه باشد که کودکے ناداں
بغلط بر هدف زند تیرے

۸۰ - گردنِ بے طمع بلند بود ۔

۸۱ - ایں شکم بے هنر پیچ پیچ
صبرندارد که بسازد به هیچ

۸۲ - یکے نقصان مایه و دوم شماتتِ همسایه ۔

۸۳ - اگر از هر دو جانب جاهلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

۸۴ - مرا بخیرِ تو امید نیست بد مرساں ۔

۸۵ - تو بر اوج فلک چه دانی چیست
چوں ندانی که در سرائے تو کیست

۸۶ - گرتوقرآں بدیں نمط خوانی . ببری رونقِ مسلمانی

۸۷ - چشم بد اندیش که بر کنده باد
عیب نماید هنرش در نظر

۸۸ - نکوئی با بداں کردن چناں ست
که بد کردن بجائے نیک مرداں

۸۹ - سرِ مانداری سرِ خویش گیر ۔

۹۰ - ناز برآں کن که خریدار تست ۔

۹۱ - خطائے بزرگاں گرفتن خطاست ۔

۹۲ - چوں مخبّط شد اعتدالِ مزاج . نه عزیمت اثر کند نه علاج

۹۳ - زنِ جواں را اگر تیرے در پهلو نشیند به که پیرے ۔

۹۴ - تو بجائے پدر چه کردی خیر
تا همان چشم داری از پسرت

۹۵ - اسپ تازی دو تگ رود بشتاب
اُشتر آهسته میرود شب و روز

۹۶ - خرِ عیسیٰ اگر بمکّه رود . چون بیاید هنوز خر با شد

۹۷ - میراثِ پدر خواهی علمِ پدر آموز -

۹۸ - اگر صد عیب دارد مرد درویش
رفیقانش یکے از صد ندانند
و گر یک نا پسند آید ز سلطان
ز اقلیمے بـه اقلیمے رسـانـنـد

۹۹ - هر که در خردیش ادب نکنند
در بزرگی صلاح از و برخاست

۱۰۰ - هر آن طفل کو جورِ آموز گار
نه بیند جفا بیند از روز گار

۱۰۱ - جورِ اُستاد به ز مهر پدر -

۱۰۲ - چو دخلت نیست خرج آهسته تر کن -

۱۰۳ - کریمان را به دست اندردرم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست

۱۰۴ - پراگنده روزی پراگنده دل . خداوندِ روزی بحق مشتغل

۱۰۵ - سگے را گر کلوخے بر سر آید
ز شادی بر جهد کایں استخوان ست
وگر نعشے دو کس پردوش گیرند
لئیم الطبع پندارد که خوان ست

۱۰۶ - هر جا که گل ست خارست -

۱۰۷ - منّت منه که خدمت سلطان همی کنم
منّت شناس از و که بخدمت بد اشتت

۱۰۸ - نه محقّق بود نه دانشمند . چار پائے بر او کتابے چند

۱۰۹ - پیش دیوار آنچہ گوئی ہو شدار
تا نباشد در پسِ دیوار گوش
۱۱۰ - ہمہ کس را عقل خود بہ کمال نماید و فرزند خود بجمال -
۱۱۱ - گراز بسیطِ زمین عقل منعدم گردد
بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نادانم
۱۱۲ - کہ خبثِ نفس نگردد بہ سالہا معلوم -
۱۱۳ - درشتی و نرمی بہم در بہ ست
چورگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ ست
۱۱۴ - مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید -
۱۱۵ - اندک اندک بہم شود بسیار -
۱۱۶ - کہ بسیار خوار است بسیار خوار -
۱۱۷ - بر رسولاں بلاغ با شد و بس -
۱۱۸ - کہن جامۂ خویش آراستن
بہ از جامۂ عاریت خواستن

یہ تمام مقولے جو نقل کیے گئے ہیں ، ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں ، مگر تقریباً اسی قدر اور فقرے اور اشعار گلستاں میں ایسے بھی ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں ، وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے -/ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں گلستان اور بوستاں شائع ہوئی ہیں ، وہاں زیادہ تر ان کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلّم میں پایا جاتا ہے اور اس لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر با زیچۂ طفلاں اور دستخوشِ کودکاں رہے ہیں - ظاہر ہے کہ جس سنّ و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ، ان کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اس نے ان کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ

کر سکیں - لیکن چونکہ بچوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار ان کو یاد رہ جاتے ہیں - پس جس قدر گلستان اور بوستان کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوکِ زبان ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغر سن کے لذّت یاب ہو چکے ہیں - ورنہ اگر یہ کتابیں بھی شیکسپئر پلیز کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے میں رہتیں اور عورت اور مرد اور بوڑھے اور جوان سب لوگ ان کو دیکھا کرتے تو میں امید کرتا ہوں کہ گلستان کا ایک بڑا حصّہ اور اس سے کسی قدر کم بوستان کے اشعار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہو جاتے جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبان زد خاص و عام ہیں ، کیوں کہ ان دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فرقے اور ہر گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے - ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو ، الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور انداز بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے - سو یہ خاصیّت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستان اور بوستان میں خصوصاً پائی جاتی ہے -

اب ہم گلستان کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستان کا حال لکھتے ہیں - یہ کتاب بھی تقریباً اسی قدر مقبول ہوئی ہے ، جس قدر گلستان ، اور اس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اسی طرح جاری ہے ، جیسے گلستان کی - مثنوی میں فردوسی کو عموماً تمام شعراً پر ترجیح دی گئی ہے اور حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا موثر اور پر جوش اس کے قلم سے

تراوش کرتا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا - لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے - ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگ و حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے ، اسی طرح اخلاق ، نصیحت و پند ، عشق و جوانی ، ظرافت و مزاح ، زھد و ریا وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاھنامہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے ، وھاں اس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی - یہی سبب ہے کہ اس کی عشقیہ مثنوی یوسف و زلیخا اس قدر مقبول نہیں ھوئی جس قدر شاھنامہ مقبول ھوا ہے - شیخ نے بوستاں میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تعریف کرنے کے بعد مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ اس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا ویسا نہیں آتا جیسا اور لوگوں کو آتا ہے - یہ قصہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ھیں کہ ”ھم کو لڑائی کا خیال ھی نہیں ہے ورنہ ھم کسی بیان سے عاجز نہیں ھیں - ممکن ہے کہ میں اپنی تیغ زبان کو میان سے نکال کر تمام دفتر شعر و سخن پر قلم پھیر دوں “ اس کے بعد ایک حکایت شاطر صفاھانی کی جنگ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے - اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت سے انکار نہیں ھو سکتا ، لیکن شاھنامہ کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جمنا مشکل معلوم ھوتا ہے -

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیات کے مرغوب و نامرغوب ھونے میں الف و عادت کو بڑا دخل ہے - مرچ جس قدر عام ھندوستانیوں کو عادت مستمرہ کی وجہ سے مرغوب ہے ، اسی قدر اکثر غیر ممالک والوں کو خلاف عادت ھونے کے سبب نامرغوب ہے - اکثر عطر ھم کو خوشگوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ھوتے ھیں - اسی طرح لطف شعر جو کہ ایک وجدانی

امر ہے بغیر الف و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا - مثلاً
انیس و دبیر کے مرثیے جس پیرائے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ
پیرایہ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا
مشکل ہے ، یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلوار اور کچھ گھوڑے کی
تعریف میں لکھے جائیں ، کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود
مرثیہ گو کی تعلّی اور فوقیت اوروں پر ظاہر ہو ، یہ بھی ضرور ہے
کہ مرثیہ مسدّس میں لکھا جائے اور مسدّس انھیں بحروں میں سے
کسی بحر میں ہو جو انیس و دبیر نے اختیار کی ہیں - پس جن
خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے ان کے بغیر کسی کی
رزمیہ نظم مقبول نہیں ہو سکتی ، ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جو
عربی الفاظ سے پاک ہو رزم لکھی جائے اور بے شمار الفاظ جن میں
فردوسی نے تصرّف کیا ہے اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کیے
ہیں ، کبھی کبھی قصداً اسی طرح برتے جائیں ، جیسے شاہنامہ
میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا
ہوا ہے ، اشعار میں بے تکلف داخل کئے جائیں - پس شیخ کی
رزمیّہ حکایت جو فردوسی کے شاہنامے سے میل نہیں کھاتی ، اس کا
یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں میں سے کسی بات کا التزام
نہیں کیا - فردوسی نے بھی یہی گُر اختیار کیا تھا ، جس سے اس
کی مثنوی مقبول ہوئی - دقیقی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار
بیتوں میں گشتاسپ اور ارجاسپ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو
پسند آ چکی تھی - جب دقیقی وہ داستان لکھ کر دفعۃً مر گیا
اور فردوسی کی نوبت آئی تو اس نے بھی وہی روش اختیار کی جو
دقیقی نے اختیار کی تھی - چنانچہ دقیقی کی لکھی ہوئی داستان عام
شاہناموں میں موجود ہے ، دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق
نہیں معلوم ہوتا ، یہاں تک کہ جو لوگ اس حال سے واقف نہیں
ہیں ، وہ اس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں -

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً متساوی الاقدام ہیں ۔ شاہنامہ ، سکندر نامہ ، مثنوی معنوی اور بوستاں ۔ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کو سکندر نامہ اور بوستاں سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوش نویس کی بے ساختہ مشق کو اس کے بنائے ہوئے اور مرتّب کیے ہوئے قطعے سے ہوتی ہے ۔ قطعہ اگرچہ رخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اس کے اجزاء میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار اور یکساں معلوم ہوتے ہیں ، مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دوائر وغیرہ بے ساختہ اس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوش نویس خود کوشش کرے تو قطعے میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے ۔ یہی سبب ہے کہ خوش نویس لوگ اگلے استادوں کی مشق کو ان کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ۔ فردوسی اور مولانا روم نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کانٹ چھانٹ نہیں کی ، مگر باوجود اس کے صدہا مقامات ان سے ایسے حسن خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلّف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے ۔

بوستاں اور سکندرنامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقیح و تہذیب اور زحمت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعت شاعری کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے ، شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں ، لیکن دونوں کے انداز بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے ۔ سکندر نامہ میں شاعرانہ مبالغہ ، زور بیان ، شوکت الفاظ ، طرفگی استعارات ، تنوع تمثیلات ، ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا ، ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور

شاندار باتیں پائی جاتی ۔ برخلاف اس کے بوستاں میں نہایت سادگی ، الفاظ کی نرمی اور گھلاوٹ ، ترکیبوں کا سلجھاؤ ، بیان کی صفائی ، عبارت کی دل نشینی ، خیالات کی همواری ، مبالغے میں اعتدال ، ماخذ میں سہولیت ، حسن ترتیب ، لطف ادا ، تمثیلات کی برجستگی، استعارات کی لطافت ، کنایات کی شوخی ، باوجود صنعت شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ھے ۔

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی هوئی ھے، مولانا نظامی سکندر نامہ میں اس طرح ادا کرتے ھیں :

فلک بر بلندی زمیں در مغاک   یکے طشت خوں شد یکے طشت خاک
بنشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت   ز خون سیاوش بسے سر نوشت
زمیں گر بضاعت بروں آورد   همه خاک در زیر خوں آورد

یہی مطلب سکندر نامہ میں دوسری جگہ اس طرح بیان هوا ھے :—

کہ داند کہ ایں دخمۂ دام و دد   چہ تاریخ ها دارد از نیک و بد
چہ نیرنگ بانجرداں ساختہ ست   چہ گردن کشاں را سرانداختہ ست

شیخ نے اس مطلب کو بوستاں میں یوں بیان کیا ھے :—

زدم تیشہ یک روز بر تلّ خاک   بگوش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار گر مردی آهستہ تر   کہ چشم و بنا گوش و روی ست و سر

یہی مطلب بوستاں میں دوسری جگہ اس طرح بیان هوا ھے :—

دریں باغ سروے نیامد بلند   کہ باد اجل بیخش از بُن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت   کہ چندیں گل اندام در خاک خفت

قناعت کی تصویر سکندر نامہ میں اس طرح دی ھے :—

تو نیز ازیں بارِ گردن زدوش   ز گردن کشاں بر نیاری خروش

چو دریا به سرمایهٔ خویش باش | هم‌ازبود خود سود خود برتراش
به مهمانیٔ خویش تا روز مرگ | درختے شو از خویشتن ساز برگ
چوپیله ز برگ کساں خوردگاز | همه تن شد انگشت و قے کردباز

بوستاں میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے :—

شنیدی که در روزگار قدیم | شدے سنگ بر دست ابدال سیم
نه پنداری این قول معقول نیست | چو قانع‌شدی‌سیم و سنگت یکے‌ست
چوطفل‌اندرون‌دارد ازحرص پاک | چه‌مشت‌زرش پیش‌وچه‌مشت خاک
خبرده بدرویش سلطاں پرست | که‌سلطاں‌زدرویش مسکیں تراست
گدا را کند یک درم سیم سیر | فریدوں بملک عجم نیم سیر
گدائے که بر خاطرش بند نیست | به از پادشاہے که‌خورسند نیست
بخسپند خوش رو ستائی و جفت | بذوقے که سلطاں در ایواں‌نخفت

مآل اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامه میں اس طرح کی گئی ہے :

سیفگن گول گر چه عار آیدت | که هنگام سر ما بکار آیدت
خرے بر کریوه ز سختی بمرد | که از کاهلی جُل با خود نه برد

یہی مضمون بوستان میں اس طرح ادا کیا گیا ہے :

به دختر چه خوش گفت بانوی ده | که روز نوا برگ سختی بنه
همه وقت پُر دار مشک و سبوی | که پیوسته‌درده رواں نیست‌جوی

[1]سکندر نامه میں یه مضمون که دشمن کو ناچیز نه سمجھنا چاہیے ، اس طرح ادا کیا گیا ہے :—

جہاں آں کسے راست‌کو در نبرد | سپے مرد نگزاشت بر هیچ مرد

---

۱ - سکندر نامه اور بوستان کے یه دونوں شعر بعد کے اڈیشنوں میں نہیں ہیں - (اسماعیل پانی پتی)

گلستاں میں یہی مضمون اس طرح بیان کیا ہے :—

دانی که چه گفت زال با رستم گُرد — دشمن نتواں حقیر و بیچاره شمرد

سکندر نامہ میں عہدِ شباب پر تحسّر اس طرح کیا گیا ہے :—

جوانی شد و زندگانی نماند — جہاں گو نماں چوں جوانی نماند
جوانی بود خوبئی آدمی — چو خوبی رود کے بود خرّمی
چو پے سست و بوسیده شد استخواں — دگر قصّهٔ خوبروئی مخواں
غرورِ جوانی چو از سرگزشت — ز گستاخ کاری فرو شوے دست
بہی چہرهٔ باغ چنداں بود — که شمشاد با لاله خنداں بود
چو بادِ خزانی در افتد بباغ — زمانه دهد جائے بلبل به زاغ
بود برگ ریزاں ز شاخ بلند — دل باغباں زاں شود دردمند
ریاحیں زبستاں شود ناپدید — در باغ را کس نه جوید کلید
بنال اے کہن بابل سال خورد — که رخسارهٔ سرخ گل گشت زرد
دو تا شد سہی سرو آراسته — که پورشد از باغ برخاسته
چو تاریخ پنجه در آمد به سال — دگر گونه شد برشتا بنده حال
سر از بارِ سنگی در آمد بسنگ — جمازه به تنگ آمد از راهِ تنگ
فرو ماند دستم ز مے خواستن — گراں گشت پایم ز برخاستن
تنم گونهٔ لاجوردی گرفت — گُلم سُرخی انداخت زردی گرفت
ہیونِ ردنده ز راه ماند باز — ببالیں گه آمد سرم را نیاز
ہماں بورِ چوگانی باد پاے — بصد زخم چوگاں نه‌جنبد زجاے
طرب را به میخانه گم شد کلید — نشانِ پشیمانی آمد پدید

بوستاں میں یہی مضمون ایک حکایت کے ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے :—

چو باد صبا بر گلستاں و زد — چمیدن درختِ جواں را سزد
چمد تا جواں ست و سرسبز خید — شکسته شود چوں به زردی رسید
بہاراں که باد آورد بید مشک — بریزد درختِ کہن برگ خشک

نه زیبد مرا با جوانان چمید — که بر عارضم صبح پیری دمید
بقید اندرم جُرّه بازے که بود — دمادم سر رشته خواهد ربود
شما راست نوبت‌برین جوان نشست — که ما از تنعم بشستیم دست
چو بر سر نشست از بزرگی غبار — دگر چشم عیش جوانی مدار
مرا برف بارید بر پّر زاغ — نشاید چو بلبل تماشائے باغ
کند جلوه طاؤس صاحب جمال — چه میخواهی از باز برکنده بال
مرا غلّه نیک آمد اندر درو — شما را کنون میدمد سبزه نو
گلستان ما را طراوت گزشت — که گل‌دسته‌بندد چو پژمرده گشت
مرا تکیه جان پدر بر عصاست — دگر تکیه بر زندگانی خطاست
مسلّم جوان راست بر پائے جست — که پیران برند استعانت بدست
گل سرخ رویم نگر زرّ ناب — فرو رفت چون زرد شد آفتاب
هوس پختن از کودک نا تمام — چنان زشت بنود که از پیر خام
مرا مے بباید چو طفلان گریست — ز شرم‌گناهان ، نه طفلانه زیست
نکو گفت لقمان که نا زیستن — به از سالها بر خطا زیستن
هم از بامدادان در کلبه بست — به از سود و سرمایه دادن زدست
جوان تا رساند سیاهی به نور — برد پیر مسکین سپیدی به نور

مذکوره بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاهر هے که شیخ کے خیالات همیشه سهل‌الماخذ هوتے هیں - وه معنی مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا هے جو همیشه خاص‌وعام کےمشاهدے میں آتی هیں ، بخلاف مولانا نظامی کے که ان کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں هوتیں -

شیخ نے جو شاطر صفاهانی کی حکایت میں اپنا رزمیه بیان دکھایا هے وه اگرچه بے تکلفی اور سادگی میں فردوسی کے بیان سے نہیں ملتا لیکن مولانا نظامی کی رزم سے جس میں سادگی کی نسبت شاعری کا زیاده لطف هے ، بہت مشابهت رکھتا هے - چند شعر اس حکایت کے

اور ان کے ہم مضمون اشعار سکندر نامہ کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں :—

سکندر نامہ	بوستاں
دو لشکر چوں مور و ملخ تاختند	دو لشکر بہم بر زدند از کمیں
نبردِ جہاں در جہاں ساختند	تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
بشمشیرِ پولاد و تیرِ خدنگ	ز باریدنِ تیر ہمچوں تگرگ
گزرگاہ بر مور کردند تنگ	بہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ
کمند اژدہائے مسلسل شکنج	بصیدِ ہژبرانِ پرخاش ساز
دہن باز کردہ بتاراج گنج	کمند اژدہائے دہن کردہ باز
زمیں کو بساطے بُد آراستہ	زمیں آسماں شد ز گردِ کبود
غبارے شد از جائے برخاستہ	چو انجم درو برق شمشیر و خود
بر انگیخت رزمے چو بارندہ میغ	چو ابر اسپِ تازی بر انگیختم
تگرگش ز پیکان و باراں ز تیغ	چو باراں پلارک فرو ریختم

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ۔ رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے ۔

شیخ علی حزین نے جس کو ہندوستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں ، بیس بائیس صفحے کی ایک مثنوی جس کا نام خرابات ہے ، بوستاں کی طرز میں لکھی ہے ، اور اپنی عادت کے موافق اس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے ۔ چنانچہ مثنوی کے خاتمہ میں فرماتے ہیں :—

سخن سنج اگر ہست ہشیار مغز کند قوتِ جاں ایں گہرہائے نغز

ازیں نامہ گردوں پُر آوازہ شد روانِ سخن گستراں تازہ شد
نوائے کہ ایں خامہ بنیاد کرد دلِ طوسی و رودکی شاد کرد
بگوش نظامی اگر میرسید سرودے ازیں خسروانی نشید
بہ تعظیم من رخ نہادے بخاک کہ آحسنت" اے نیّرِ تابناک
و گر سعدیِ شہد پرور ادا شنیدے ز صورِ نئے من نوا
سماعش ز سر عقل بردے و ہوش زباں سہر کردے شدے جملہ گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزیں نے اپنے نزدیک اس مثنوی میں بوستاں کے تتبّع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اس کو اپنے لیے ایک سرمایۂ نازش سمجھتا تھا ۔ سوانح عمری میں اسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ "بسیارے از مطالب عالیہ و سخنان دلپذیر دراں کتاب بسلکِ نظم در آمد" مگر دونوں کتابوں یعنی بوستاں اور خرابات کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں ۔ ایک جاندار ، دوسری بے جان ۔ لفظ اچھے ، بیان اچھا ، مطالبہ عمدہ ، یہ سب کچھ سہی مگر شیخ کے بیان میں ایک چھپا ہوا جادو ہے جو بوستاں کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے ۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے ۔ قحط کا بیان ایک جگہ بوستاں میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے ۔ ہم دونوں کے اشعار اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور جو فرق دونوں کے طرز بیان اور طریقۂ ادا میں ہے اس کو بھی کسی قدر بیان کریں گے ۔

خرابات	بوستان
شنیدم که در عہدِ بہرام گور نمود از قضا قحط سالی ظہور چو صحرائے محشر زمیں تف گرفت بہ در یوزۂ آسماں کف گرفت سحابِ سیه دل نشد مہرباں بحالِ لبِ تشنۂ خاکیاں بخیلی نمود ابر بر کائنات بمہدِ زمیں سوخت طفلِ نبات زخشکی بر اندامِ خاک دو تُوہ عُروقِ شجر شد چو رگہائے کوہ زتاب فروزنده مہر بلند زمیں مجمر و دانه بودش سپند بطِ مے چو پستانِ بے شیر شد زخشکی چو پیکاں گلو گیر شد	چناں قحط سالی شد اندر دمشق که یاراں فراموش کردند عشق چناں آسماں بر زمیں شد بخیل که لب تر نه کردند زرع و نخیل بخوشید سر چشمه هائے قدیم نماند آب جز آبِ چشم یتیم نبودے بجز آہِ بیوہ زنے اگر برشدے دودے از روز نے جو درویش بےبرگ دیدم درخت قوی بازواں سست و درمانده سخت نه بر کوه سبزی نه در باغ شخ ملخ بوستاں خورد و مردم ملخ

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرع میں جس حسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے اس سے بہتر کوئی اسلوبِ بیان خیال میں نہیں آتا ۔ قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اس ایک مصرع میں ہوئی ہے کہ ''یاراں فراموش کردند عشق'' سہل و ممتنع لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے وہ اسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنف سے بھی ویسا بیان

نہ ہو سکے، اس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں، یہ اسلوب ان سب سے علاحدہ ہے۔ قحط کی سختی ہمیشہ اس طرح بیان کی جاتی ہے ''ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہو گئی، آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے، ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا، لاکھوں جاندار بھوک کے مر گئے''۔ غرضیکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلّے کی گرانی، پانی کی نایابی، بھوک کی تکلیف اور اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں۔ شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے نرالا اور سب سے بلیغ ہے۔ اس اسلوب سے اس کو یہ جتانا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی، باوجود اس کے لوگ اس کو بھول گئے تھے اور یاراں کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنف بھی اسی عشّاق کے جرگے میں سے تھا۔ دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ مینہ نہ برسا تھا، مگر اس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے، تیسرے شعر میں پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اس سے مستثنیٰ کرنا، چوتھے شعر میں کسی گھر کے روزن سے باورچی خانے کے دھوئیں کا نہ نکلنا اور پھر اس سے رانڈوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنیٰ کرنا، پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا، یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں۔ چھٹا شعر بلاغت اور حسن بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے جیسا پہلا۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا، درختوں کا سر سبز نہ ہونا، چشموں اور ندیوں کا خشک ہو جانا، یتیموں کا رونا، گھروں میں کھانا نہ پکنا، بے وارث رانڈوں کے آہ و نالے، درختوں کا بے برگ و بار اور

غریبوں کا بے سر و سامان ہونا ، پہلوانوں اور زبردستوں کا در ماندہ ہوجانا ، پہاڑ اور جنگل میں سبزہ اور ہریاول کا نہ رہنا ، ٹڈیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا ٹڈیوں کو کھانا ، یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر و بیشتر ظہور میں آتی ہیں -

حزین نے باوجودیکہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے ، بوستاں سے پانچ سو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے ، اپنی پوری طاقت شیخ کے تتبع میں صرف کی ہے، کوئی کرشمہ اس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا جس کو دیکھ کر جی بے اختیار پھڑک اٹھے -

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے ، اس میں کوئی خوبی قابل ذکر نہیں ، دوسرے شعر میں زمین تفتہ کو صحرائے محشر سے تشبیہ دینا تعریف الشئی بالمجہول کے قبیل سے ہے ، یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہل دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے - صحرائے محشر اور تمام اعتقادیات خود تمثیل کی محتاج ہیں، ان پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی - تیسرا شعر بوستان کے اس شعر سے ماخوذ ہے جو ذوالنّون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے :-

خبرشد بہ مدین پس از روز بیست که ابر سیہ دل بر ایشان گریست

مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے، جس سے ترحم اور برسنا دونوں باتیں ٹپکتی ہیں اور حزین نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے ، جس سے دونوں معنی ویسے صاف نہیں نکلتے - چوتھا شعر شیخ کے اس شعر سے ماخوذ ہے -

چناں آسماں بر زمین شد بخیل کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرت ناک ہے بہ نسبت اس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جائے ۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرع بہت عمدہ ہے مگر پہلا مصرع تکلّف سے خالی نہیں ۔ شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں ، پس اندام اور دوتوہ کے لفظ کو افادۂ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے ۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان کیا ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اس پر ڈالا جاتا تھا ، وہ سپند کا حکم رکھتا تھا ۔ پس فرو زندہ اور بلند جو دو صفتیں سہر کی واقع ہوئی ہیں انھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ فرو زندۂ سہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ سہر بلند کہنے سے اس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں ۔ ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلاف عادت اور خلاف مقتضائے مقام ہے ۔ نہ قحط کا یہ خاصّہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے ۔

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمے کے لکھا ہے اس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی پر حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے اور نہ بوستان کو خرابات سے افضل ثابت کرنا مدّ نظر ہے ، کیوں کہ نہ ہم شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے ، بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی بے عیب ہو ، جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلے میں لائی جاتی ہے جو اس

سے بہ مراتب افضل اور فائق ہو تو اس میں بیسیوں فرو گزشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں - اگر خرابات بوستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسن اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزین کے بیان میں چون و چرا کرنے کا خیال بھی نہ آتا ، کیوں کہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامۃ الورود ہیں -

اب ہم گلستان اور بوستان کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو ان کے مقبول ہونے میں بہت بڑا دخل ہے - مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی ، کہیں صرف گلستان سے اور کہیں بوستان سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیں گی -

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان میں سرتا پا اخلاق اور تہذیب نفس کے مضامین مندرج ہیں ، مگر میرے نزدیک ان کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواعظ کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور لطاقت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا - اخلاق میں بیسیوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستان اور بوستان میں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو ، مگر کوئی کتاب ان دونوں کتابوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی - اس سے ظاہر ہے کہ قبول‌عام کا مدار زیادہ تر حسن بیان اور لطف ادا پر ہے نہ کہ نفس مضامین پر - البتہ مضامین کو بھی شہرت اور مقبولیت میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے ، اسی لیے جو محاسن ان کتابوں کے ہم آگے لکھنا چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حسن معنی اور اسلوب بیان سے متعلق ہوں گے -

۱ - سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ان دونوں کتابوں میں یہ

ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ ان کتابوں میں اس قدر کم ہیں کہ چند مقامات مستثنیٰ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانۂ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو اور یہ امر ایسی پرانی کتابوں میں جن کے زمانۂ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ گزر چکے ہیں، کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے -

مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خاصہ ہے، ان کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعراء کے کلام میں سچ - اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزہ ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں - مثلاً شیخ بوستان میں کہتا ہے :-

"میان دو کس دشمنی بود و جنگ سراز کبر بریکدگر چوں پلنگ
زدیدار هم تا بحدّے رماں کہ برهردو تنگ آمدے آسماں"

دوسری بیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے کہ جب کبھی راہ میں دوچار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اس وقت کمال نفرت سے ان کا یہ جی چاہتا تھا کہ آسمان جو سامنے حائل نظر آتا ہے اس کو توڑ کر نکل جائیں - یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النّظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، کیوں کہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے - پس جس طرح ادنیٰ درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے، اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں -

× شیخ[1] اور دیگر شعرائے ایران کے مبالغے میں جو فرق ہے

---

۱ - یہاں سے "زیادہ وقعت رکھتی ہیں" تک کی عبارت موجودہ ایڈیشنوں میں نہیں ہے - اس زائد عبارت کے اول اور آخر میں نے کانٹی (×) کا نشان لگا دیا ہے - (اسماعیل پانی پتی)

وہ ذیل کی مثال سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ مولوی نظامی سکندر نامہ میں فرماتے ہیں :

سخن گرچہ با او زہازہ بود نگفتن ہم از گفتنش بہ بود

یعنی بات کیسی ہی عمدہ ہو اس کا نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ مقصود یہ ہے کہ خاموشی بہت اچھی چیز ہے۔ شیخ اسی باب میں یوں کہتا ہے :

"کمال‌ست در نفسِ انسان سخن تو خود را بگفتار ناقص مکن"

مبالغہ مولانا اور شیخ دونوں کے شعروں میں موجود ہے۔ دونوں کو بسیار گوئی کی برائی بیان کرنی منظور تھی، سو اس کو بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ سرے سے بولنے ہی کو منع کر دیا، مگر مولانا کے بیان میں ایک نوع کا تحکّم اور ادّعائے محض پایا جاتا ہے، یعنی یہ کہ بات کیسی ہی عمدہ اور تحسین و آفرین کے قابل ہو، اس کے کہنے سے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ شیخ کے شعر میں بھی یہی مطلب ادا کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ دلیل بھی موجود ہے، یعنی یہ کہ اچھی بات انسان کے نفس میں ایک کمال ہے، جب اس نے وہ بات منہ سے نکالی تو گویا اس میں ایک کمال کم ہو گیا، پس آدمی ایسا کام کیوں کرے جس سے اس کے کمال میں نقصان پیدا ہو۔ اگرچہ یہ کوئی منطقی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک تمثیل ہے جس میں معقول کو محسوس کے پیرائے میں بیان کیا ہے مگر قیاسات شعریّہ و خطابیّہ میں ایسی تمثیلیں دلائل و براہین منطقیّہ سے زیادہ وقعت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً گلستان میں ایک دولت مند بخیل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"مالدارے را شنیدم کہ بہ بخل چناں معروف بود کہ حاتم طائی

بسخاوت ۔ ظاهر حالش بنعمتِ دنیا آراستہ و خسّت نفس در نہادش هم چناں متمکن ، تا بجائے کہ نانے را بجا نے از دست نہ دادے و گربۂ ابوهریرہ را بہ لقمہ ننواختے و سگِ اصحاب کہف را استخوانے نینداختے ، فی الجملہ کسے خانۂ او را ندیدے در کشادہ و سفرۂ او را سر کشادہ ۔ بیت ،

درویش بجز بوئے طعامش نشمیدے
مرغ ازپسِ ناں خوردنِ او ریزہ نچیدے

ایک اور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اس طرح کیا ھے :

''سہمگین آبے کہ مرغابی در و ایمن نبودے ''۔

اگر غور سے دیکھیے تو حد سے زیادہ مبالغہ ھے مگر بادی النّظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ھوتی ۔

سوپر نیچرل یعنی فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصّے بھی جن سے قدیم اور متوسّط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ھوا ھے، ان کتابوں میں بہت کم ھیں ۔ تمام گلستان اور بوستان میں صرف دو تین حکایتیں ایسی ھیں جو اس زمانے میں مستبعد معلوم ھوتی ھیں اور تاویل کے بعد ان میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رھتا ۔

علم اخلاق کے بعض اصول جن میں همیشہ اختلاف رھا ھے اور اب بھی چلا جاتا ھے ، اگر کسی کتاب میں زمانۂ حال کے فلسفۂ مسلّمہ کے برخلاف ھوں تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ھو سکتا ، کیوں کہ ایسی کوئی کتاب نہیں ھو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ھو ۔ مثلاً شیخ کے اس فقرے پر کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستئی فتنہ انگیز''۔ اکثر مشنیری لوگ کہتے ھیں کہ جھوٹ کیسا ھی مصلحت آمیز ھو سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ھرگز نہیں ھو سکتا۔ اس بحث کے متعلق ھمارے ایک دوست نے نہایت

دلچسپ قصہ نقل کیا ۔ انھوں نے کہا کہ ایک علمی سوسائٹی میں
چند یورپین عالم اور مشنیری موجود تھے۔ راستی اور دروغ پر ایک
مضمون پڑھا گیا، جس میں گلستان کے فقرۂ مذکور کی تائید کی گئی
تھی۔ ایک پادری صاحب نے کہا کہ مضمون عمدہ ہے مگر جس قدر
اس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے، اس میں سے نکال دینا چاہیے۔
اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا ۔ آخر
ہمارے دوست جو اس قصے کے راوی ہیں ، انھوں نے کھڑے
ہو کر کہا کہ اس بحث کا محاکمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اپنی
ذاتی اغراض کے لیے تو بے شک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز
نہیں ، لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی
حالت میں جھوٹ بولنا بے شک سچ بولنے سے بہتر ہے ۔ اس کے
بعد انھوں نے یہ مثال دی کہ سنہ ۱۸۵۷ء میں جو اکثر لوگوں نے
رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یورپین عورتوں اور بچوں کو
ظالموں اور بے رحموں کے شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں
چھپا لیا تھا اور باغی لوگ ان کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک
ایک سے ان کا حال پوچھتے تھے ، ایسی حالت میں جھوٹ بول
کر ان بے گناہوں کو خطرے سے بچانا بے شک سچ بولنے سے بہتر
تھا ۔ اس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے
اتفاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا ۔ مذکورہ بالا توجیہ کی تائید
خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے کیوں کہ اس نے گلستان کے
آٹھویں باب میں اپنی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت برا
بتایا ہے ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :

گر راست سخن باشی و در بند بمانی
به زانکه دروغت دهد از بند رهائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ ”صورت مفروضہ میں بھی
مقتضائے جواں مردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں

کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں ان مظلوموں پر نثار کیا جائے - جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب ان مظلوموں کی باری آئے تو آئے ''۔ لیکن ہمارے نزدیک جب ہی تک جواں مردی ہے کہ ظالموں کے مقابلہ کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے ان بے گناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو، ورنہ یہ حرکت تہوّر اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی -

اسی طرح شیخ کے اس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے -

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے
نا کس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

کیوں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث اور فضول اور بیکار ہیں مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبّلت بدل جاتی ہے یا نہیں، علم اخلاق کے ان مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا - انگلستان کے ایک روشن ضمیر موّرخ کی رائے ہے کہ حال کی سویلزیشن نے انسان کے اخلاق پر اس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں، مگر گناہ بدستور موجود ہیں - پہلے زمانے میں بے شک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے - اور اب اگر چہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں - اسی لیے رسول خدا (صلعم) نے فرمایا ہے کہ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلت سے نہیں ٹلتا -

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ''یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے، شریف نہیں ہو سکتا ''۔ فی الواقع اس سے کمال تعصّب

پایا جاتا ھے ، مگر اس پر کوئی مہذّب سے مہذّب بھی اعتراض نہیں کر سکتا - ھر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ھی سمجھتی رھی ھے - آریہ نے ھندوستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا - مسلمانوں نے بھی اپنے دور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی با ایں همه شائستگی و تہذیب نوبلٹی یا شرافت کو اپنی ھی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ھیں -

ایک اور جگه گلستاں میں لکھا ھے که اگلے زمانے میں ایک مریض بادشاہ کے لیے چند حکمائے یونان نے آدمی کا پتّا جو خاص صفات سے موصوف ھو تجویز کیا تھا ، مگر تجربے کی نوبت نہیں آئی - یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ھے ، شاید ایسا ھی ھو ، مگر شیخ اس اعتراض سے بری ھے ، اس کا الزام جو کچھ ھے مجّوزین پر ھے نه ان کی تجویز کے راوی پر - شیخ پر البته اس صورت میں اعتراض ھو سکتا تھا که وہ ان کی تجویز کو پسند کرتا ، یا یہ لکھتا که اس سے بادشاہ کو شفا ھو گئی ، یا جو فرض معلّمین اخلاق کا ھے (یعنی ھر قصّے اور افسانے سے ایک مفید نتیجه استخراج کرنا) اس سے عہدہ برآ نه ھوتا -

بعض ملاّیانه اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سنے گئے - مثلاً اس نے گلستاں میں کہا ھے :

رہ راست برو اگرچه دور است　　زن بیوہ مکن اگرچه حور است

اس پر بعض حضرات یه نقص وارد کرتے ھیں که جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ھے ، اس سے منع کرنے کے کیا معنی - اور بعض کٹ ملاّ بیوہ کی جگه ھیوہ[1] بتاتے ھیں ، جس کے

---

۱ - ھیوہ کے معنی لغت میں متجدد اور متغیر ھونے کے لکھے ھیں جو اس شعر میں کسی طرح چسپاں نہیں ھو سکتے - (حاشته حیات‌سعدی شائع کردہ ملک چنن دین تاجر کتب لاھور ، صفحه ۱۲۱)

معنی انھیں کو معلوم ھیں ۔ یہ ویسا ھی اعتراض ھے جس پر کسی نے کہا تھا ''شعرِ مرا بمدرسہ کہ بُرد ؟'' ظاھر ھے کہ شیخ کی کتاب گلستان کوئی فقہ کا فتاویٰ نہیں ھے کہ جس کی ھر امر و نہی کو امر و نہی مصطلح فقہا پر محمول کیا جائے ۔ وہ اکثر اپنے تجربہ اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ھے، اس کی ترغیب دیتا ھے اور جس کو مضر سمجھتا ھے، اس سے منع کرتا ھے ۔ گو فقہا نے اس کو مُباح لکھا ھو کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ھے ۔ رھی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ھے ، سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثیّبات پر ثابت ھوتی ھے ۔

سب سے زیادہ معقول اعتراض بوستان کی اس حکایت پر وارد ھوتے ھیں ، جس میں شیخ نے سومنات کا قصّہ لکھا ھے ، مگر ھم نے اس کی بابت پہلے باب میں کچھ عذر لکھے ھیں جن سے اعتراض کسی قدر ھلکے ھو سکتے ھیں ۔

امرد پرستی کا ذکر جو ان کتابوں میں اکثر آتا ھے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ھوتی ھے ، مگر اس باب میں جو کچھ ھم نے خاتمۂ کتاب میں لکھا ھے وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ھے ۔

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اس کے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت میں کچھ فرق آئے اور زیادہ ان کی عظمت ثابت ھوتی ھے ۔ کپڑا جس قدر زیادہ اُجلا ھوتا ھے اسی قدر جلد ذرا سے دھبّے سے میلا ھوتا ھے ۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ھے ، یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رھی ھیں اور آج کل بھی کہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ھے ، اسی طرح مشرقی سلسلۂ تعلیم کا جزو اعظم ھیں ۔ ان کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرع کو نہایت غور سے دیکھا گیا ھے ۔ مشنریوں نے صرف

اس وجہ سے کہ ان میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئیں ہیں اور ایسے مضامین کا سلسلۂ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے برخلاف ہے ، ان پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے طولانی ریویو لکھ کر چھپوائے ہیں ، نیز اس لحاظ سے کہ ان کتابوں کو زیادہ تر صغیر سن بچے پڑھتے ہیں اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے ۔ باوجود ان سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا ، جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلا شبہ اس قدر ۔ عیب ہیں جس قدر کہ زمانۂ متوسط میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا ۔

۲ ۔ دوسری عام اور بڑی خوبی جو ان کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے ، وہ شیخ کا انداز بیان ہے ، جس کا ملکہ اس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا ۔ یہ بات نہ قواعد علم بلاغت کی پابندی سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی اُستاد کی تعلیم سے آتی ہے ، بلکہ جس طرح حُسن صورت اور حُسن صوت قدرتی خوبیاں ہیں اسی طرح حسن بیان بھی ایک جبّلی خاصّہ ہے جس میں اکتساب کو کچھ دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور کمال موقوف ہے ۔ جو مطلب اس کو بیان کرنا ہوتا ہے اس کے لیے ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ ڈھونڈ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا ۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے ۔ ”اَلصَّمْتُ زِیْنَۃُ الْعَالِمِ و سِتْرُ الْجَاھِلِ“۔ (یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاھل کی پردہ پوش) اس مطلب کو وہ شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے :

ترا خامشی اے خداوند ہوش وقارست و نا اہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبتِ خود مبر ۔۔۔ و گر جاھلی پردۂ خود مدر

یا مثلاً اس کو بیان کرنا ھے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سنتے وہ آخر کو پچھتاتے ھیں یا زک اٹھاتے ھیں ، اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ھے :

''ھر کہ نصیحت نشنود سر ملامت شنیدن دارد'' یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا ھے کہ ھر شے کی قدر اس کے کمیاب ھونے سے ھوتی ھے ، اس کو وہ اس طرح لکھتا ھے :

''اگر شبہا ھمہ شبِ قدر بودے شب قدر بے قدر بودے''

یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا ھے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ھے ، اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ھے :-

''ھر کہ با دانا ترے از خود مجادلہ نماید تا بدانند کہ دانا ست بدانند کہ نادانست''۔

یا مثلاً اس مطلب کو کہ سب پیٹ کی خاطر سختی اٹھاتے ھیں ، وہ اس عنوان سے بیان کرتا ھے :

''اگر جور شکم نبودے ھیچ مرغ در دام نیفتادے بلکہ صیّاد خود دام ننہادے''۔

یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھیما ھو جاتا ھے ، اس طرح بیان کرتا ھے :-

ھمہ کس را دندان بہ ترشی کُند گردد مگر قاضیان را بہ شیرینی''۔ یا مثلاً اس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذّتوں کو ترک کرنا برا ھے ، وہ اس اسلوب سے ادا کرتا ھے :

''ھر کہ ترک شہوت از بہرِ قبولِ خلق دادہ است از شہوتِ حلال در شہوتِ حرام افتادہ است''۔ یا مثلاً اس کو یہ لکھنا ھے کہ کسی کی آہ و زاری سے قضائے الٰہی نہیں بدلتی اور قانون قدرت

نہیں ٹوٹتا ، اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے :

قضا دگر نشود ور ہزار نالہ و آہ　　بشکر یا بہ شکایت برآید از دہنے
فرشتہ کہ وکیل ست بر خزانۂ باد　　چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

یا اس کو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکار یہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہنچائے گی ، اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے :—

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اسے بیان کرنا ہے ایک واقعے کی صورت میں بیان کر کے اس کو زیادہ پُر تاثیر اور دل نشین کر دیتا ہے ، مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزارہا اُمیدیں اور ارمان دل میں لیے ہوئے مر گئے اسی طرح ایک روز ہم تم بھی مر جائیں گے ، اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے -

شنیدم کہ یکبار در دجلۂ　　سخن گفت با عابدے کلۂ
کہ من فرّ فرماندھی داشتم　　بسر بر کلاھے مہی داشتم
سپہرم مدد کرد و نصرت و فاق　　گرفتم ببازوئے دولت عراق
طمع کردہ بودم کہ کرماں خورم　　کہ ناگہ بخوردند کرماں سرم
بکن پنبۂ غفلت ازگوش ہوش　　کہ از مُردگاں پندت آید بگوش

اخیر کے شعر سے اس نے یہ بات جتا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپری نہیں بولی تھی بلکہ یہ صرف ایک بیان کرنے کا پیرایہ ہے ، یا مثلاً اس کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے ، اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :—

یکے جہود و مسلماں خلاف مے جستند — چناں کہ خندہ گرفت از نزاع ایشانم
بہ طنز گفت مسلماں گر ایں قبالۂ من — درست نیست ، خدایا جہود میرانم
جہود گفت بتوریت می خورم سوگند — وگر خلاف کنم ہم چو تو مسلمانم
گر از بسیط زمیں عقل منعدم گردد — بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا موثر اور دلاویز نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس پیرایے نے اس کو دلاویز اور موثر کر دیا ہے ۔ یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ امن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصے جھگڑوں سے علاحدہ رہے اور خود داری کو ہاتھ سے نہ دے ، اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :—

دو کس گرد دیدند و آشوب و جنگ — پرا گندہ نعلین و پرّندہ سنگ
یکے فتنہ دید از طرف بر شکست — یکے در میاں آمد و سر شکست
کسے خوشتر از خویشتن دار نیست — کہ با خوب و زشت کسش کار نیست

یا مثلاً اس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے ، وہ ایک بڑی جواب دہی اپنے ذمے لیتا ہے ، اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے :—

آں شنیدی کہ صوفیے مے کوفت — زیر نعلین خویش میخے چند
آستینش گرفت سرہنگے — کہ بیا نعل بر ستورم بند

اس میں پیرایۂ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا کے درجے کی برتی ہے ۔ یا مثلاً اس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا جو ایک مذموم خصلت ہے ، اس کا الزام صرف فقیروں ہی پر نہیں ، بلکہ دولت مندوں پر بھی ہے ، اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے :— ''خواہندۂ مغربی در صف بزازان حلب می گفت ، اے خداوندان نعمت اگر شما را انصاف

بودے وما را قناعت رسم سوال از جہاں برخاستے''۔ یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے ، اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۔

یکے قطرہ باراں زابرے چکید　　خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریاست من کیستم　　گر او ہست حقا کہ من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید　　صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بجائے رسانید کار　　کہ شد نامور لولوئے شاہوار
بلندی بداں یافت کو پست شد　　درِ نیستی کوفت تا ہست شد

یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں، اسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں ، اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۔

زاہدے در میان رنداں بود　　زاں میاں گفت شاہدے بلخی
گر ملولی ز ما ترش منشیں　　کہ تو ہم در میان ما تلخی

کبھی وہ اپنے ہی کلام کو کسی اور کا مقولہ قرار دے کر نہایت بامزہ کر دیتا ہے جیسے :-

در یتیم جگر کرد روزے کباب　　کہ میگفت گوینده بار باب
دریغا کہ بے ما بسے روز گار　　بروید گل و بشگفد نو بہار
بسے تیر و دے ماہ و آردی بہشت　　بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت

یا جیسے :-

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن　　کہ مے گویند ملاحاں سرودے
اگر باراں بہ کوہستاں نہ بارد　　بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یا جیسے :-

''ہم چناں درفکرآں بیتم کہ گفت   پیل بانے بر لب دریائے نیل
زیر پایت گر بدانی حال مور   ہمچو حال تست زیر پائے پیل''

یا جیسے :-

''چہ خوش گفت با کودک آموزگار   کہ کارے نکردیم و شد روزگار''

یا جیسے :-

آں شنیدی کہ شاھدے بہ نہفت   با دل از دست دادۂ مے گفت
تا تُرا قدر خویشتن باشد   پیش چشمت چہ قدر من باشد''

۳ - ان دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجّب انگیز ھے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ھیں اور تقریباً نصف گلستاں کے فقرے مُسجّع اور مقفّیٰ ھیں ، با این ھمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ھیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ھے وھاں سب سے پہلے گلستاں کی مثال دی جاتی ھے - فی الواقع یہ شیخ کی کمال انشا پردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ھے - شاعر اور منشی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ھے تو اس کے کلام میں خواھی نخواھی بناوٹ اور تکلّف پیدا ھو جاتا ھے اور سررشتۂ حسن معنی ھاتھ سے جاتا رھتا ھے- شیخ نے صنائع لفظی و معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ھے کہ کہیں ساختگی اور تصنّع کا گمان نہیں ھوتا مگر وہ ان عارضی آرایشوں کا ایسا پابند نہیں ھے کہ ان کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ھو جائے - جہاں الفاظ مساعدت کرتے ھیں ، وھاں ایک ھلکی سی چاشنی اس کی بھی دے دیتا ھے - اس کی نثر میں مسجّع اور مرصّع فقرے سادے فقروں میں ایسے ملے ھوئے ھیں ، جیسے پشمینے کی شال میں ریشم کے تار ، جب تک خاص توجّہ سے نہ دیکھا جائے ، تمام فقرے یکساں اور ھموار معلوم ھوتے ھیں - البتّہ

بعض حکایتوں میں اس نے صنائع لفظی و معنوی کی زیادہ رعایت کی ہے - جیسے ساتویں باب کی انیسویں حکایت ، جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تونگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے، مگر اس میں بھی الفاظ کو حسن معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا - جس قدر اس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حسن انتظام پایا جاتا ہے ، اس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیت اور واقعیت موجود ہے - حکایت مذکور کے چند متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

" تونگراں دخل مسکینانند و ذخیرۂ گوشہ نشیناں ، و مقصد زائراں و کہف مسافراں و متحمل بارگراں از بہر راحت دگراں - دست بطعام آنگہ برند کہ متعلقاں وزیر دستاں بخورند و فضلۂ مکارم ایشاں بہ ارامل و ایتام و پیراں و اقارب و جیراں برسد[1] .... از معدۂ خالی چہ قوت آید ، و از دست تہی چہ مروت زاید و از پائے بستہ چہ سرآید و از دست گرسنہ چہ خیر ...... فراغت با فاقہ نمی پیوندد ، و جمعیت با تنگدستی صورت نہ بندد ، یکے تحریمۂ عشا بستہ ، و دیگرے منتظر عشا نشستہ ایں بداں کے ماند ...... اشارت خواجۂ عالم[2] بفقر طائفہ ایست کہ مرد میدان رضا اند و تسلیم تیر قضا ، نہ ایناں کہ خرقۂ ابرار پوشند و لقمۂ ادرار نوشند ...... مشغول کفاف از دولت عفاف محروم است و ملک فراغت زیر نگین رزق معلوم ...... -

گفت چنداں مبالغہ در وصف ایشاں یکردی و سخنہائے پریشاں بگفتی کہ وہم تصور کند تر یاقند یا کلید خانۂ ارزاق ، مشتے متکبر و مغرور و معجب و نفور - مشتغل مال و نعمت و مفتتن

---

۱ - یہ نشان ...... اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیئے گئے ہیں -

جاه و ثروت۔ سخن نگویند الاّ بسفاهت و نظر نه کنند الاّ بکراهت، علما را به گدائی منسوب کنند و فقرا را به بےسروپائی معیوب گردانند ، بعزّت مالے که دارند و غیرتِ جاهے که پندارند بر تر از همه نشینند و خود را بهتر از همه شناسند ، نه آن در سردارند که سر بکسے فرود آرند بےخبر از قولِ حکما که گفته اند ''هر که بطاعت از دیگران کم ست و بنعمت بیش ، بصورت تو نگر ست و بمعنی درویش'' .... گفتم مذمّت ایشان روا مدار که خداوندان کرم اند ۔ گفت غلط کردی که بندگانِ درم اند ۔ چه فائده که ابر آذارند و بر کس نمی بارند ، و چشمهٔ آفتابند و بر کس نمےتابند ، و بر مرکبِ استطاعت سوارند و نمیرانند ، و قدمے بهر خدا ننهند ، و درمے بے منّ و اذیٰ ندهند ۔ مالے بمشقّت فراهم آرند و به خسّت نگهدارند ، و بحسرت بگزارند ، چناں که بزرگاں گفته اند ''سیم بخیل وقتے از خاک بر آید که بخیل به خاک در آید .... گفتمش بر بخل خداوندان نعمت وقوف نیافتهٔ الاّ به علّتِ گدائی ، وگرنه هر که طمع یکسو نهد ، کریم و بخیلش یکے نماید ۔ محک داند که زر چسیت ، و گدا داند که مُمسک کیست .... محالِ عقلست که اگر ریگِ بیاباں دُر شود ، چشم گدایاں پُر شود .... هرگز دیدهٔ دستِ دغائی بر کتف بسته ، یا بعلّت بے نوائی در زنداں نشسته ، یا پردهٔ معصومی دریده ، یا کفے از معصمِ بریده ، الاّ به علّتِ درویشی ، شیر مرداں را بحکم ضرورت در نقب‌ها گرفته اند ، و کعب ها سفته ...... اغلب تهی دستان دامنِ عصمت به معصیت آلایند و گرسنگاں نان مردم ربایند ۔

بیت

چو سگِ درّنده گوشت یافت نه پُرسد
کین شُتَر صالح[۴] ست یا خرّ دجّال

. . . گفتانه ، کہ من بر حال ایشان رحمت می برم ، گفتم نہ کہ بر مال ایشان حسرت می خوری. . . . .
. . . . هر بیذقی کہ بر اندے بدفع آن کوشیدے ، و هر شاہے کہ بخواندے بفرزیں بپوشیدے ، تا نقد کیسۂ همت در باخت ، و تیر جعبۂ حجت همه بینداخت. . . . . . . هر جا کہ گل ست خار ست و با خمر خمار ، و بر سر گنج مار ، و آنجا کہ دُرّ شاہوار ست ، نہنگ مردم خوار ، لذّتِ عیش دُنیا را لدغۂ اجل در پس است ، و نعیم بہشت را دیو مکاره در پیش. . . .
نظر نه کنی در بستان کہ بید مشک ست و چوب خشک ، هم چنیں در زمرۂ تونگراں شاکرند و کفور و در حلقۂ درویشاں صابرند و ضجور. . . . مقرّباں حضرت حق جلّ و علا تونگرانند درویش سیرت و درویشانند تونگر همّت ، مہین تونگراں آنست کہ غم درویشاں بخورد ، و بہین درویشاں آن کہ کم تونگراں گیرد . . . . . . نعم طائفۂ هستند بدیں صفّت کہ بیان کردی ، قاصر همت و کافر نعمت کہ ببرند و بنہند و بخورند و ندهند . . . . . . قومے بریں نمط هستند کہ شنیدی ، وطائفه خوانِ نعمت نہاده و صلائے کرم درداده ، و میاں بخدمت بسته ، وابرو بتواضع کشاده طالبِ نام اند و مغفرت و صاحبِ دنیا و آخرت ۔

شیخ اکثر ان کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظت بلیغ کے کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو۔ پھر اپنے حسن بیان سے تمام حکایت کو نہایت لطیف و ملیح کر دیتا ہے اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ یا لطیف کنایہ ایراد کر کے اس میں نون مرچ لگا دیتا ہے تاکہ پند و موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دور ہو جائے۔ چنانچہ گلستان کے خاتمے میں اس نے لکھا ہے کہ :—

"غالب گفتار سعدی طرب انگیز ست و طیب آمیز - و کوته نظراں را بدیں علّت زبان طعنه دراز که "مغز دماغ بیهوده بردن ودود چراغ بے فائده خوردن کار خردمنداں نیست" و لیکن بر رائے روشن صاحبدلاں که روئے سخن در ایشان ست پوشیده نماند که دُرّ موعظت هائے صافی در سلک عبارت کشیده است و داروئے تلخ نصیحت بشهد ظرافت آمیخته ، تا طبع ملول انسان از دولتِ قبول محروم نماند "۔

جو ظرافت اس نے گلستاں اور نیز بوستاں میں برتی ہے وہ اکثر نہایت سنجیدہ اور معقول ہے ۔ البتّہ کہیں کہیں اس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانون شرم و حیا سے کسی قدر متجاوز ہیں لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد اور عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور ان کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمشیہ تقریر و تحریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے ، ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رک نہیں سکتی ۔

نکو رو تاب مستوری ندارد　　چو در بندی‌سر از روزن برآرد

اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں :—

مثال ۱ - مہمانِ پیرے بودم در دیارِ بکر که مال فراواں داشت و فرزندے خوبروے - شبے حکایت کرد که "مرا در همه عمر جُز ایں فرزند نبوده است ، درختے دریں وادی زیارت‌گاه ست که مردماں به حاجت خواستن آنجا روند - شب هائے دراز در پائے آں درخت بحق نالیده ام تا مرا ایں فرزند بخشیده"- شنیدم که پسر

با رفیقاں همی گفت ''چه بودے اگر من آں درخت را بدانستمے که کجا است تا دعا کردمے که پدرم زود تر بمیرد ''۔ خواجه شادی کناں که پسرم عاقلست و پسر طعنه زناں که پدرم فرتوت لا یعقل ۔

قطعه

سالها بر تو بگذرد که گزر نکنی سوئے تربتِ پدرت
تو بجائے پدر چه کردی خیر تا هماں چشم داری از پسرت

مثال ۲ ۔ پیر مردے را حکایت کنند که دخترے خواسته و حجره بگل آراسته و بخلوت با او نشسته و دیده و دل در و بسته ، شبهائے دراز نخفتے و بذله‌ها و لطیفه‌ها گفتے ، باشد که موانست پذیرد و وحشتِ نگیرد ۔ بالجمله شبے میگفت ''بخت بلندت یار بود و چشمِ دولتت بیدار که به صحبت پیرے افتادی پخته ، پروردهٔ ، جهاندیدهٔ ، آرسیدهٔ ، نیک و بد جهاں آزمودهٔ ، سردِ و گرم روزگار چشیدهٔ که حق صحبت بداند و شرطِ موّدت بجا آرد ، مشفق و مهربان خوش طبع و شیریں زبان ۔

مثنوی

تا توانم دلت بدست آرم در بیازاریم نیازارم
ورچو طوطی‌شکر بود خورشت جانِ شیریں فدائے پرورشت

نه گرفتار آمدی بدست جوانے مُعجب ، خیره رائے ، سر تیز ، سبک پائے که هر دم هوّسے پزد و هر شب جائے خسپد و هر روز یارے گیرد ۔

قطعه

جواناں خرّم اند و خوب رخسار و لیکن در وفا با کس نپایند
وفاداری مدار از بلبلاں چشم که هردم برگلے دیگر سرایند

برخلاف پیران که بعقل و ادب زندگانی کنند ، نه بمقتضائے جہل و جوانی -

بیت

ز خود بہترے جوے و فرصت‌شمار که باچون خودے گم کنی روزگار

گفت - چندآن که بریں نمط بگفتم گمان بردم که دلش در قید من امد و صید من شد - ناگاه نفسے سرداز دل پر درد بر آورد و گفت ، که چندیں سخن که گفتی در ترازوئے عقل من وزن آن یک سخن ندارد که وقتے شنیده ام از قابلۂ خویش که گفت ''زن جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند به که پیرے'' فی‌الجمله امکان موافقت بنود بمفارقت انجامید - چون مدت عدتش بسر آمد عقد نکاحش بستند با جوانے تند ، ترش روئے ، تہیدست ، بد خوئے ، جور و جفا مے دید و رنج و عنا میکشید و شکر نعمت حق هم چنان میگفت که الحمدلله که ازان عذاب الیم برهیدم و بدیں نعمت مقیم رسیدم -

قطعه

با تو مرا سوختن اندر عذاب به که شدن با دگرے در بہشت
بوے پیاز از دهن خوبروے خوب‌تر آید که گل از دست زشت

مثال ۳

مرا حاجیے شانۂ عاج داد که رحمت بر اخلاق حجاج باد
شنیدم که بارے سگم خوانده بود که از من بنوعے دلش مانده بود
بینداختم شانه کیں استخوان نمی بایدم دیگرم سگ مخوان
مپندار چون سرکۂ خود خورم که جور خداوند حلوا برم
قناعت کن اے نفس بر اندکے که سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش خسرو بحاجت روی چو یکسو نہادی طمع خسروی

یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرع میں رحمت کا لفظ کنایۃً بجائے نفریں اور اس کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے کیوں کہ شعراء کے نزدیک حاجیوں کی سنگدلی ، قساوت اور تکبّر وغیرہ صفات ذمیمہ مسلّم ہیں - چنانچہ گلستان میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا ہے :

از من بگوئے حاجی مردم گزاے را
کو پوستین خلق بہ آزار میدرد
حاجی تو نیستی شترست از برائے آنکہ
بے چارہ خار میخورد و بار میبرد

ایک اور شاعر کہتا ہے :

چوں عاملے کہ دل ز دریخانہ جمع کرد
حاجی ستم بخلقِ خدا بیشتر کند

پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اس کنائے میں ہے وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی - اکثر نا واقف لوگ اس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں مگر حکایت کا مضمون جس سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے ، حقیقی معنی سے ابا کرتا ہے -

مثال ۳ - بازارگانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شتر بارداشت و چہل بندۂ خدمتگار - شبے در جزیرۂ کیش مرا بحجرۂ خویش برد ، و ہمہ شب نیارمیداز سخنہائے پریشاں گفتن کہ ''فلاں انبارم بہ ترکستان ست ، و فلاں بضاعت بہ ہندوستاں ، و ایں قبالۂ فلاں زمیں است و فلاں مال را فلاں کس ضمیں''- گاہ گفتے کہ خاطر اسکندریہ دارم کہ ہوایش خوش ست و باز گفتے نے ، دریائے مغرب مشوّش ست - سعدیا سفر دیگر در پیش ست ، اگر آں کردہ شود بقیہ عمر بگوشہ نشینم - گفتم آں کدام سفر ست ؟ گفت گوگردِ پارسی بہ چیں خواہم بُردن کہ شنیدم قیمتِ عظیم دارد ، و از آنجا کاسۂ چینی بروم برم و دیبائے رومی بہ ہند ، و پولادِ ہندی

به حلب و آبگینهٔ حلبی به یمن ، و بُرد یمانی به پارس ۔ ازاں پس ترکِ سفر کنم و بدکانے نشینم ''۔ چندانے ازیں مالیخولیا فرو گفت که بیش طاقتِ گفتنش نماند ۔ گفت ، سعدی تو هم سخنے بگو از آنها که دیدی و شنیدی ۔ گفتم ۔

نظم ۔

آں شنیدستی که وقتے تاجرے   در بیابانے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگِ دنیادار را   یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

مثال ۵

ملک صالح از بادشاهانِ شام   بروں آمدے صبح دم با غلام
بگشتے در اطراف بازار و کوے   بر سم عرب نیمه بر بسته روے
که صاحب نظر بود و درویش دوست   هر آں کیں دو دارد ملک صالح اوست
دو درویش در مسجدے خفته یافت   پریشاں دل و خاطر آشفته یافت
شبِ سردشاں دیده نا برده خواب   چو حربا تأمل کناں آفتاب
یکے زاں دو مے گفت با دیگرے   که در روزِ محشر بود داورے
گر ایں بادشاهانِ گردن فراز   که در لهو و عیش اند و باکام و ناز
در آیند با عاجزاں در بهشت   من از گور سر بر نگیرم زخشت
بهشت بریں ملک و ماوائے ماست   که بندِ غم امروز برپائے ماست
همه عمر ازایناں چه دیدی خوشی   که در آخرت نیز زحمت کشی
اگر صالح آنجا بدیوارِ باغ   در آید بکفشش بدرّم دماغ
چو مرد ایں سخن گفت و صالح شنید   دگر بُودن آنجا مصالح ندید
دمے رفت تا چشمهٔ آفتاب   ز چشم خلائق فرو شست خواب
رواں هر دو کس رافرستاد و خواند   به هیبت نشست و به حرمت نشاند
بر ایشاں ببارید بارانِ جود   فروشست شاں گرد ذُل از وجود
پس از رنج سرما و باران و سیل   نشستند با نامدارانِ خیل
گدایانِ بے جامه شب کرده روز   معطّر کناں جامه برعود سوز

یکے گفت ازایناں ملک را نہان | کہ اے حلقہ در گوش حکمت جہان
پسندیدگاں در بزرگی رسند | ز ما بندگانت چہ آمد پسند
شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت | بخندید در روئے درویش و گفت
سن آنکس نیم کز غرور حشم | ز بے چارگاں روئے درہم کشم
تو ہم باسن از سر بنہ خوئے زشت | کہ نا سازگاری کنی در بہشت
من امروز کردم در صلح باز | تو فردا مکن در بروئیم فراز
چنیں راہ گر مقبلی پیش گیر | شرف بایدت دست درویش گیر
براز شاخ طوبی کسے بر نداشت | کہ امروز تخم ارادت نہ کاشت
ارادت نداری سعادت مجوے | بچوگان خدمت تواں برد گوے
ترا کے بود چوں چراغ التہاب | کہ از خود پری ہمچو قندیل ز اب
وجودے دہد روشنائی بہ جمع | کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

۵۔ وہ اکثر نہایت پاکیزہ اور لطیف نکتے جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں ، ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے ، جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں ۔

مثال ۱ ۔ ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات ست و چوں بر می آید مفرح ذات ۔ پس در ہر نفسے دو نعمت موجودست و بر ہر نعمتے شکر واجب ۔

یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں سانس انسان کی زندگی اور تفریح کا باعث ہیں ، سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے ، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے ۔

مثال ۲

چو طفل اندروں دارد از حرص پاک
چہ مشت زرش پیش وچہ مشت خاک

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچہ حرص اور طمع سے پاک

ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس کو سونے اور مٹی میں
کچھ تمیز نہیں ہوتی ، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹی کو
برابر جاننا جو کہ اعلیٰ درجے کے عرفا اور خدا رسیدہ لوگوں کا
منصب ہے ، بچے کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے
سبب حاصل ہے کیونکہ سونے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا اس
میں جبھی تک باقی رهتا ہے ، جب تک حرص اور طمع پیدا نہیں
ہوتی ۔ پس ایک شاعر نہ کہ فلسفی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ
دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں ۔

مثال ۳

ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم   د گر با چو او صد برائی بجنگ
ازاں مار برپائے راعی زند   کہ ترسد سرش را بکوبد بہ سنگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زیر دست
بھی زبردستوں پر غالب آ جاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی
کبھی چرواہے پر چل جاتا ہے ، مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جو
اپنے سے ڈرے اس سے ڈرنا چاہیے کیوں کہ عام خیال یہ ہے کہ
جو اپنے سے ڈرے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔

مثال ۴

وہ کہ گر مردہ باز گردیدے   بہ میان قبیلۂ و پیوند
ردّ میراث سخت تر بودے   وارثاں را از مرگ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور
یہ بھی معلوم تھا کہ مرگ خویشاوند سخت مصیبت ہے ، مگر یہ
نکتہ مخفی تھا کہ اگر مردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس
دینا اس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا ۔

اسی طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگزشتوں سے ایسے

نادر اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ھے جو وھم و گمان میں نہیں ھوتے ۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی ، ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دے کر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی ۔ چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دے کر اس سے لی جا سکتی ھے ۔ پس جو لوگ عمر کو عیش شیریں میں برباد کرتے ھیں ، شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے ۔ یا مثلاً میں ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عیدگاہ میں گیا ، اتفاقاً خلقت کے ھجوم میں باپ سے بچھڑ گیا ، میں اسی حالت میں رو رھا تھا کہ باپ نے آ کر دفعۃً میرا کان مروڑا اور فرمایا ''میں نے تجھ کو بارھا کہا ھے کہ میرا دامن پکڑے رھا کر ، مگر تو نہیں مانتا ''۔ سچ ھے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا ، اسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دستگیری کے منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا ۔

یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا ، شیخ علیہ الرحمۃ ھمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ھے ، مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ھے ۔ اس سے میں نے جانا کہ ھر عضو کا نام لینا روا نہیں ھے ۔

یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اینٹھ کر کہا کہ ''نالائق میں نے تجھ کو کلھاڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی ، مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی ''۔ اسی طرح زبان ذکر اور شکر کے لیے بنی ھے ، لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی۔ یا مثلاً ایک شخص مٹی میں سنا ھوا مسجد میں جانے لگا ، دوسرے نے اس کو جھڑک دیا کہ ''خبردار جو مسجد میں قدم رکھا ''۔ میرا دل یہ بات سن کر بھر آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ھے دامن آلودہ لوگ نہ جا سکیں گے ۔

٦۔ حسن تاویل اور لطف استدلال جیسا جچا تلا اس کے کلام

میں پایا جاتا ہے ، ایسا اور شعراً کے کلام میں نہیں دیکھا گیا ۔

مثال ۱

شنیدی کہ در روزگارِ قدیم شدے سنگ در دستِ ابدال سیم
نہ پنداری ایں قولِ معقول نیست چو قانع شدی سیم‌وسنگت‌یکے‌ست

یعنی یہ جو مشہور ہے کہ اگلے زمانے میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے ، اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے ، کیوں کہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں ان کے نزدیک پتھر اور چاندی میں کچھ فرق نہیں ہوتا ۔ ایک امرِ خارقِ عادت کو کس حسن بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت کیا ہے ۔

مثال ۲

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
تو ان گفتن ایں با حقائق شناس ولے خوردہ گیرند اہلِ قیاس
کہ پس آسمان و زمیں چیستند بنی آدم و دام و دو کیستند
پسندیدہ پرسیدی اے ہوشمند بگویم گر آید جوابت پسند
کہ ہامون و دریا و کوہ و فلک پری آدمی زاد و دیو و ملک
ہمہ ہرچہ ہستند زاں کمتر اند کہ با ہستیش نامِ ہستی برند
عظیم ست پیش تو دریا بہ موج بلند ست گردونِ گرداں بہ اوج
دلے اہلِ صورت کجا پے برند کہ اربابِ معنی بملکے درند
کہ‌گر آفتاب ست یک‌ذرہ نیست وگر ہفت دریا ست یک قطرہ‌نیست
چو سلطانِ عزت علم بر کشد جہاں سر بجیبِ عدم در کشد

یہاں اس نے وحدتِ وجود کے اصلی معنی جو کہ اہلِ ظاہر کی سمجھ سے بالا تر تھے نہیں بتائے ، بلکہ اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے ، نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے

بیان کیے ہیں کہ اور کوئی نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا ۔

مثال ۳

نگہدار فرصت کہ عالم دمے ست   دمے پیش دانا بہ از عالمے ست
سکندر کہ بر عالمے حکم داشت   درآں دم کہ بگزشت و عالم گزاشت
میسّر نبودش کزو عالمے   ستانند و فرصت دہندش دمے

یہاں اس نے دو متضاد دعوے کیے ہیں ۔ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے ۔ دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک تمام عالم سے بہتر ہے ۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل سے ثابت کیا ہے کیوں کہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا رہا تو معلوم ہوا کہ اسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اس کو تمام عالم کے عوض میں نہ مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا ۔ یہ نہایت درجے کا حُسن استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی شگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل سے ثابت کیے جائیں اور حسن شعری بھی ہاتھ سے نہ جائے ۔

۷۔ ینچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی‌الواقع لاثانی ہے ۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں ، لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو ویسے پاکیزہ اور دل نشین بیان کے ساتھ ادا کر سکے ۔ اس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے ۔ شعر

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مثال ۱

گر از حق نہ توفیقِ خیرے رسد   کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد

زباں را چه بینی که اقرار داد — به بیں تا زباں را که گفتار داد
در معرفت دیدۂ آدمی ست — که بکشاده بر آسماں و زمیست
کیت فہم بودے نشیب و فراز — گر ایں در نه کردے بروے تو باز
سر آوردو دست ازعدم در وجود — دریں جود بنہاد و دروے سجود
وگرنه کے از دست جود آمدے — محالست کز سر سجود آمدے
بهحکمت زباں داد وگوش آفرید — که باشند صند وق دل را کلید
اگر نه زباں قصه بر دا شتے — کس از سرِّ دل کے خبر داشتے
وگر نیستے سعی جاسوس گوش — خبر کے رسیدے به سلطان هوش
مرا لفظ شیریں خواننده داد — ترا سمع دراکِ داننده داد
مدام ایں دوچوں حاجباں بر درانذ — ز سلطاں به سلطاں خبر مے برند
چه اندیشی ازخود که فعلم نکوست — ازاں درنگه کن که تقدیر اوست
برد بوستاں باں به ایوانِ شاه — به تحفه ثمرهم ز ایوانِ شاه

اس نظم میں اس نے یه بات بیان کی هے که بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں هو سکتا اور زبان ، کان ، آنکھ ، سر اور هاتھ جن ظاهری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے هیں ، وہ اغراض بیان کی هیں - یه تمام باتیں کم و بیش هر شخص کو معلوم هوتی هیں ، مگر جس ترتیب سے شیخ نے ان کو بیان کیا هے اس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم هوتا هے۔ اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو که بادشاہ هی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جاتا هے ، تمثیل دے کر مضمون کا حُسن انتہا کو پہنچا دیا هے -

مثال ۲

دو صد مُہرہ دریکدگر ساختست — که گِل مہرۂ چوں تو پرداختست
رگت در تنست اے پسندیده خوے — زمینے در و سیصد و شصت جوے
بصر در سر و فکر و رائے و تمیز — جوارح بدل دل بدانش عزیز

بهائم بُرو اندر افتاده خوار | تو هم چون الف بر قدمها سوار
نگون کرده ایشان سر از بهر خور | تو آری بعزت خورش پیش سر
نه زیبد ترا با چنین سروری | که سر جز بطاعت فرود آوری

مثال ۳

شب از بهر آسائش تست و روز | مهِ روشن و مهرِ گیتی فروز
صبا از برائے تو فراش وار | همے گسترانند بساط بهار
اگر باد و بر فست و باران و میغ | وگر رعد چوگاں زند برق تیغ
همه کاردارانِ فرماں برند | که تخمِ تو در خاک مے پرورند
وگر تشنه مانی ز سختی مجوش | که سقائے ابر آبت آرد بدوش
زخاک آورد رنگ و بوئے و طعام | تماشا گه دیدهٔ و مغز و کام
عسل دادت از نحل و منّ از هوا | رُطب دادت از نخل و نخل از نوا
همه نخل بندان بخایند دست | ز حیرت که نخلے چنیں کس نه بست
خور و ماه و پرویں برائے تو اند | قنادیل سقفِ سرائے تو اند
ز خارت گل آورد واز نافه مشک | زرازکان و برگ تر از چوب خشک
بدستِ خودت چشم و ابرو نگاشت | که محرم به اغیار نتوان گزاشت
توانا که آں نازنیں پرورد | بالوانِ نعمت چنیں پرورد
بجاں گفت باید نفس بر نفس | که شکرش نه کارِ زبانست و بس

۸ - وہ اکثر قانونِ قدرت سے اشیا کے حسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسام استدلال کی نسبت زیادہ دل‌نشین اور عام فہم ہوتا ہے - کلام الٰہی میں بھی مبداو معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے -

مثال ۱

پلیدی کند گربه بر جاے پاک | چو زشتش نماید بپوشد به خاک
تو آزادی از ناپسندیده ها | نترسی که بروے فتد دیده ها

بلی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول وبراز کرتی ہے، اس کو فوراً مٹی سے ڈھانک دیتی ہے، اس سے وہ اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ برے اعمال کو ہمیشہ لوگوں سے چھپانا چاہیے - جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کے برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے -

مثال ۲ - حلم شتر چناں کہ معلوم ست اگر طفلے مہارش گیرد و صد فرسنگ ببرد گردن از متابعت او نہ پیچد - اما اگر راہے ہولناک پیش آید کہ موجب ہلاک باشد و طفل آنجا بنادانی خواہد رفتن، زمام از کفش در گسلاند و بیش متابعت نکند کہ ہنگام درشتی ملاطفت مذموم ست -

قطعہ

کسے کہ لطف کند با تو خاک پایش باش
وگر ستیزہ کند در دو چشمش افگن خاک
سخن بلطف وکرم با درشت خوئے مگوے
کہ زنگ خوردہ نگردد مگر بسوہن پاک

یہاں اس کو یہ سمجھانا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک دوسری طرف سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو، ورنہ مذموم ہے - اس مطلب پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا، ایک بچہ اس کی نکیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لے جاتا ہے، مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اس کی اطاعت نہیں کرتا، اور رسی توڑ کر بھاگ جاتا ہے -

مثال ۳

برہ در یکے پیشم آمد جوان   بہ تگ در پیش گوسفندے دواں

بدو گفتم این ریسمانست و بند که می آرد اندر پیت گوسفند
سُبک طوق و زنجیر از و باز کرد چپ و راست پوئیدن آغاز کرد
بره در پیش هم چناں میدوید که جوخورده بود از کف مرد و خید
چوباز آمد از عیش و بازی بجاے مرادید وگفت اے خداوند راے
نه این ریسماں می برد با منش که احسان کمندیست درگردنش
به لطفے که دید است پیل دماں نیارد همے حمله بر پیل باں
بداں را نوازش کن اے نیک مرد که سگ پاس دارد چو نان تو خورد
بر آں مرد کُند است دندانِ یوز که مالد زباں بر پنیرش د روز

یہاں اس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو گے ، اسی قدر لوگ تمھارے دوست اور خیر خواہ و جاں نثار ہوں گے - اس پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ بکری ، ہاتھی ، کتا ، چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جو شخص ان کی پرورش کرتا ہے اور ان کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اسی کا دم بھرنے لگتے ہیں - یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبعیّت باقی نہیں رہتی -

۹ - وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تلخ اور بے مزہ اور سامعین کے دل پر گراں ہوتی ہیں نہیں کرتا بلکہ اکثر آزادانہ اور محقّقانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں ، لیکن حدِّ شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے ان کو زاهد اور رند دونوں پسند کرتے ہیں -

مثال ۱

بسرهنگِ سلطاں چنیں گفت زن که خیز اے مبارک در رزق زن
برو تا ازخوانت نصیبے دهند که فرزندگانت بسختی درند
بگفتا بود مطبخ امروز سرد که سلطاں بہ‌شب نیّت روزه کرد
زن از نا امیدی سرانداخت پیش همی‌گفت باخود دل از فاقه ریش

کہ سلطاں ازیں روزہ گوئی چہ خواست ۔ کہ افطار او عید طفلان ماست
خورندہ کہ خیرش برآید زدست ۔ بہ از صائم الدّھر دنیا پرست
مسلّم کسے را بود روزہ داشت ۔ کہ در ماندۂ را دھد نان چاشت
وگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری ۔ ز خود بازگیری وہم خود خوری

مثال ۲

شنیدم کہ مردے براہِ حجاز ۔ بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز
چناں گرم رو در طریق خدائے ۔ کہ خار مغیلاں نکندے ز پائے
بہ آخر ز وسواس خاطر پریش ۔ پسند آمدش در نظر کار خویش
بہ تلبیس ابلیس در چاہ رفت ۔ کہ نتواں ازیں خوب تر راہ رفت
گرش رحمتِ حق نہ دریافتے ۔ غرورش سر از جادہ برتافتے
یکے ھاتف از غیب آواز داد ۔ کہ اے نیک بخت مبارک نہاد
مپندار گر طاعتے کردۂ ۔ کہ نُزلے دریں حضرت آوردۂ
بہ احسانے آسودہ کردن دلے ۔ بہ از الف رکعت بہر منزلے

۱۰ - جب اس کو کسی خاص فرقے یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو ان کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے ۔ مثلاً اس کو یہ منظور تھا کہ امراء اور دولتمندوں کو ان کے عیوب سے مطلع کرے تو اس نے اس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا ، بلکہ ایک فرضی مناظرہ اپنا اور ایک اور شخص کا جس میں اپنے تئیں امرأ کا طرف دار اور اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حمایتی قرار دیا ہے ، لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں ۔ طرف ثانی امیروں کی برائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور شیخ اس کی تقریر کو رد کر کے امراء کی خوبیاں اور درویشوں کی برائیاں ظاہر کرتا ہے ۔ اسی طرح اس نے تمام سلاطین عہد اور وزراء اور امراء کی خاطر خواہ خبر لی ہے ۔ چنانچہ گلستاں کے ساتویں باب میں یہ

مناظرہ موجود ہے - یا مثلاً اس کو مشائخ و زہاد کی قلعی کھولنی منظور تھی ، اس مضمون کو اس نے کھلم کھلا ادا نہیں کیا بلکہ ایک قصہ جو کہ بوستاں کے چوتھے باب میں مذکور ہے ، نقل کیا ، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا - صاحب خانہ کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا - سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اس کی اور اس کے ساتھ تمام فقرا اور مشائخ کی تفضیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے - جتنے واقعی عیب اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں وہ سب ظاہر کر دیے - جب شیخ صاحب ان کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اس مقولے پر ختم کرتے ہیں :

نخواہم دریں باب ازیں بیش گفت
کہ شنعت بود سیرت خویش گفت

یعنی میں اس باب میں اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہو گی ''اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے''- کیوں کہ آپ بھی اسی گروہ میں سے ہیں - پھر اس بزرگ کی تواضع اور تحمل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زبان درازیوں کے اس نے کچھ برا نہ مانا اور اس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا -

۱۱ - یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ اتنے مؤثر نہیں ہوتے جتنے اپنی سرگزشت اور روداد کا بیان مؤثر ہوتا ہے ، بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو ، کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سنی جاتی ہے اس کا یقین بہ نسبت اس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سنی جائے - دوسرے ناقل اپنی سرگزشت کو بہ نسبت اخبار ماضیہ کے زیادہ پر جوش الفاظ

میں بیان کر سکتا ہے ۔ گلستاں اور بوستاں میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور ان سے نتائج استخراج کیے ہیں ، اس لیے ان کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں ۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان ان کو بیان کرتا ہے ۔ ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں ۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

مثال ۱

بصنعادرم طفلے اندر گزشت ‫ ‫ چه گویم کزانم چه بر سرگزشت
قضا نقش یوسف جالے نه کرد ‫ ‫ که ماهی گورش چو یونس نخورد
دریں باغ سروے نیامد بلند ‫ ‫ که باداجل بیخش از بن نه کند
عجب نیست برخاک اگر گل شگفت ‫ ‫ که چندیں گل اندام درخاک خفت
بدل گفتم اے ننگ مرداں بمیر ‫ ‫ که کود کرود پاک و آلوده پیر
ز سودا و آشفتگی بر قدش ‫ ‫ بر انداختم سنگے از مرقدش
ز هولم دراں جاے تاریک و تنگ ‫ ‫ بشورید حال و بگردید رنگ
چو باز آمدم زاں تغیّر بهوش ‫ ‫ ز فرزند دلبندم آمد بگوش
گرت وحشت آمد ز تاریک جاے ‫ ‫ بهش باش و با روشنائی در آے
شب گور خواهی منوّر چو روز ‫ ‫ ازینجا چراغ عمل بر فروز
تن کارکن مے بلرزد ز تب ‫ ‫ مبادا که نخلش نیارد رطب
گروهے فراواں طمع ظن برند ‫ ‫ که گندم نیفشانده خرمن برند
براں خورد سعدی که بیخے نشاند ‫ ‫ کسے برد خرمن که تخمے فشاند

۱۲ - جب اس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی مباحث پیش نہیں کرتا جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں ، بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد دلاتا ہے جو اس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گزرتی اور ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں اور جب کسی

امر پر اس کو متنبّہ کرنا منظور ہوتا ہے تو ایسے صریح اور صاف نتیجے سُجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں ۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سکھاتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھنچتے ہیں اور اس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدّت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے ۔

مثال ۱

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن ‏ ‏ ‏ ‏ غبارش بیفشان و خارش بکن
چو بینی یتیمے سر افگندہ پیش ‏ ‏ ‏ ‏ مدہ بوسہ بر روئے فرزند خویش
یتیم ار بگرید کہ نازش خرد ؟ ‏ ‏ ‏ ‏ و گر خشم گیرد کہ بارش برد؟
الا تا نگرید کہ عرش عظیم ‏ ‏ ‏ ‏ بلرزد همے چون بگرید یتیم
بہ رحمت بکن آبش از دیدہ پاک ‏ ‏ ‏ ‏ بہ شفقت بیفشانش از چہرہ خاک
اگر سایۂ او برفت از سرش ‏ ‏ ‏ ‏ تو در سایۂ خویشتن پرورش
من آنگہ سر تاجور داشتم ‏ ‏ ‏ ‏ کہ سر در کنار پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس ‏ ‏ ‏ ‏ پریشان شدے خاطر چند کس
کنون گر بزندان برندم اسیر ‏ ‏ ‏ ‏ نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلان خبر ‏ ‏ ‏ ‏ کہ در طفلی از سر برفتم پدر

مثال ۲

پسر چون زدہ بر گزشتش سنین ‏ ‏ ‏ ‏ ز نا محرمان گو فراتر نشین
بر پنبہ آتش نشاید فروخت ‏ ‏ ‏ ‏ کہ تا چشم برہم زنی خانہ سوخت
چو خواہی کہ نامت بماند بجاے ‏ ‏ ‏ ‏ پسر را خردمندی آموز و راے
کہ گر عقل و رایش نباشد بسے ‏ ‏ ‏ ‏ بمیری و از تو نماند کسے
بسا روزگارا کہ سختی برد ‏ ‏ ‏ ‏ پسر چون پدر نازکش پرورد
خردمند و پرہیزگارش برار ‏ ‏ ‏ ‏ گرش دوست داری بنازش مدار

بخُردی درش زجر و تعلیم کن
به نیک و بدش وعده و بیم کن

نو آموز را ذکر و تحسین وزه
ز توبیخ و تهدید استاد به

بیاموز پرورده را دعت رنج
وگر دست داری چو قارون بگنج

مکن تکیه بر دستگاهے که هست
که باشد که نعمت نماند بدست

بپایاں رسد کیسهٔ سیم و زر
نگردد تہی کیسهٔ پیشه ور

چه دانی که گردیدن روزگار
بغربت بگرداندش در دیار

چو بر پیشهٔ باشدس دسترس
کجا دست حاجت برد پیش کس

ندانی که سعدی مکاں از چه یافت
نه هاموں نوشت و نه دریاشگاف

بخُردی بخورد از بزرگاں قفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا

هر آں طفل کو جور آموز گار
نه بیند ، جفا بیند از روزگار

پسر را نکو دار و راحت رساں
که چشمش نماند بدست کساں

هر آں کس که فرزند را غم نخورد
دگر کس غمش خورد و آواره کرد

نگه دار ز آمیزگار بدش
که بدبخت و بے ره کند چوں خودش

پسر کو میان قلندر نشست
پدر گو زخیرش فرو شوے دست

دریغش مخور بر هلاک و تلف
که پیش از پدر مرده به ناخلف

یه خصوصیتیں جو گلستاں اور بوستاں میں هم نے بتائی هیں زیاده غور کرنے سے اور بھی بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی هیں جو ان کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث هوئی هیں ، مگر هم انهیں پر اقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے هیں ۔

غزلیاتِ شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو فی زمانہ فارسی اور اردو دیوانوں میں مروّج ہے، اس طریقے پر غالباً سب سے اوّل شیخ ہی کا دیوان مدوّن کیا گیا ہے، کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوان غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعۂ قصائد کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

علی بن احمد بے ستون جامع کلیّات شیخ نے اوّل ہر غزل کے مطلع کا حرفِ اوّل لے کر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیے تھے۔ آخر اس ترتیب میں یہ قباحت نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا، چنانچہ شیخ کی وفات سے بیالیس برس کے بعد اس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہو گئی۔

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، چار دیوان ہیں، جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طیّبات ہے۔ باقی تین دیوان اس سے چھوٹے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سنِّ کہولت اور پیری کے زمانے کے ہیں، مگر شیخ کا انداز بیان ابتدا ہی سے تغزّل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبار صفائ اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ عنفوان شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا

جیسا سنّ کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے ، مگر شیخ کا کلام اس سے مستثنیٰ ہے ۔ البتہ طیّبات اور بدائع جو جوانی اور کہوت کے زمانے کے دیوان ہیں ، ان میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے ۔

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نمکدان شعراء لکھا ہے ۔ اگرچہ اس سے پہلے انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصائد میں بھی مثل متاخّرین کے اکثر تشبیبوں میں تغزّل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے ، مگر اس وقت غزل میں یہ لذّت نہ تھی جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی ۔ پہلے شاعری کا مدار زیادہ تر قصیدے اور مثنوی پر تھا ۔ بعضے دو بیتی (یعنی رباعی) اور قطعے کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے ۔

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور با مزہ کر دیا کہ لوگ قصیدے اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے ۔ غزل گویوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے ۔ اسی واسطے بعض شعراً نے شیخ کو غزل کا پیمبر کہا ہے مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بدون ذوق سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں ۔ پس صرف یہ کہ دینا کہ اس کا کلام دیوان نمکدان شعراً ہے، یا وہ غزل کا پیمبر ہے انہیں کے لیے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا مذاق رکھتے ہیں ۔ ان کے سوا اور لوگ جب تک کوئی صریح مابہ الامتیاز شیخ اور قدماً کی غزل میں بیان نہ کیا جائے ، یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزل کو کیا فوقیت ہے ، لیکن وجدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے ۔

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدماً کی غزلیات

میں ہے صاف صاف معلوم ہو۔ مجھ کو چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قدماء کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنھوں نے غزل کو نہایت بامزہ اور لطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام کر دیا ہے۔

۱۔ شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزّل اور تغنّی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی ابن احمد جامع کلّیات شیخ جس نے شیخ سے بیالیس برس بعد اس کا کلام جمع کیا، اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی، جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی"۔

نظرِ خدائے بیناں زسرِ ہوا نباشد
سفرِ نیاز منداں ز رہِ خطا نباشد

مجلس کے خاص و عام جا بجا بیہوش اور خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخاست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدّت عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔ میں کہتا ہوں کہ ایک بار میں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے شیخ کے ایک مطلع پر جو قوّال نے بے مزامیر کے ان کے سامنے گایا تھا، دیکھا کہ ان کا تمام بدن کانپنے لگا تھا اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور یہ کیفیت ان پر بہت دیر تک طاری رہی تھی۔ وہ مطلع یہ تھا :

اے کہ آگاہ نۂ عالم درویشاں را
توچہ دانی کہ چہ‌سودا و سرست ایشاں‌را

۲ - شیخ کی غزل کو اس جبّلی عشق و محبت نے جو اس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا - عرب اور عجم کے تمام شعراً جو عاشق مزاج ہوئے ہیں ، ان کی تشبیب اور تغزّل میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے، جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی - چنانچہ شیخ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :

آنکہ نشمیدست ہر گز بوئے عشق
گو بشیراز آؤ خاک ما بہ‌وئے

یہی سبب ہے کہ وہ حسن و عشق، وصل و جدائی ، یاس و امید، صبر و مجبوری ، وعدہ و انتظار اور دیگر لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے ان میں بالکل تصنّع نہیں پایا جاتا ، اور وہ سب باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم میں ہر شخص پرگزرتی ہیں۔ اسی‌واسطے عشّاق کے دل پر ان کا زیادہ اثر ہوتا ہے - ایسے اشعار سے شیخ کے چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں ، مگر چند شعر بطور نمونے کے یہاں لکھے جاتے ہیں :

مقدار یار ہم نفس چوں من نداند ہیچ کس
ماھی کہ در خشک اوفتد قیمت بداند آب را

اے کہ‌گفتی ہیچ مشکل چون فراق یارنیست
گر امید وصل باشد آں چناں دشوار نیست

ہر کو ہمہ عمرش سودائے گلے بودہ است
داند کہ چرا بلبل دیوانہ ھمی باشد

دل و جانم بتو مشغول ونگہ برچپ و راست
تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

دیگران چون بروند از نظر از دل بروند
تو چنان در دل من رفته که جان در بدنے

گفته بودم که رخت بر بندم
تا ره بصره گیرم و بغداد
دست از دامنم نمی دارد
خاک شیراز و آب رُکنا باد

هزار جهد بکردم که سرّ عشق بپوشم
نبود بر سر آتش میسّرم که نجوشم
به زخم خورده حکایت کنم زدست جراحت
که تندرست ملامت کند چو من بخروشم

نفحاتِ صبح دانی ز چه روے دوست دارم
که به روے دوست ماند که برافگند نقابے
برو اے گدائے مسکیں ودرے دگر طلب کن
که هزار بار گفتی و نیامدت جوابے

شربتے تلخ تر از دردِ فراقت باید
تا کند لذّتِ وصلِ تو فراموش مرا

بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را
از ذوق اندرونش پروائے در نباشد

برق یمانی بجست باد بهاری بخاست
طاقتِ مجنوں نماند خیمهٔ لیلیٰ کجاست

۳ - اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا کہ کوئی خاص موقع ہے اور وہاں جو حالت اس نے آنکھوں سے دیکھی ہے

یا جو کیفیت اس کے دل پر گزری ہے اس کو بیان کر رہا ہے۔ اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں اسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے، نہایت مزا دیتے ہیں۔ مثلاً

اے زو بہک چرانہ نشستی بجائے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

ساربان آہستہ ران کارامِ جان در محمل ست
اشتران را بار بر پشت ست و ما را بر دل است

چہ روے است اینکہ پیشِ کاروان است
مگر شمعے بدستِ ساربان است
سلیمان ست گوئی در عماری
کہ بر بادِ صبا تختش روان است
ز روئے کارِ من برقع برانداخت
بیک بار آنکہ در برقع نہان است
شتر پیشی گرفت از من بر فتار
کہ بر من بیش ازان بار گران است
بدار اے ساربان محمل زمانے
کہ عہدِ وصل را آخر زمان است

یار بار افتادہ را در کاروان بگذاشتند
بیوفا یاران کہ بر بستند بارِ خویش را
ہرکرا در خاکِ غربت پائے در گل ماند ماند
گود گر در خوابِ خوش بیند دیار خویش را

پیوند روح میکند این بادِ مشک بیز
ہنگام نوبتِ سحر ست اے ندیم خیز

شاهد بخوان و شمع بسوزاں و گل بنہ
عنبر بسائے و عود بسوزاں و گل بریز

خادمۂ سرائے را گو در حجرہ بند کن
تا بہ سر حضور ما رہ نبرد موسوسی

۴۔ وہ اکثر حالات و واردات کو جو اس کے دل پر گزرتے ہیں تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے۔ اس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا روم کے کلام میں بھی بہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً

بگنج شائگاں افتادہ بوم
ندانستم کہ در گنج اند ماراں

اے برادر ما بہ گرداب اندریم
و آنکہ شنعت میزند بر ساحل ست

رُطب شیریں ودست از نخل کوتاہ
زلال اندر میان و تشنہ محروم

استاد کیمیا را بسیار زر بباید
در خاک تیرہ کردن تا آنکہ زر بباشد

۵۔ شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے، جس سے قدما کی غزل معرّا معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر ایسے لطیف اور خوشنما پیرائے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گراں بہا کر دیتا ہے۔

بود همیشه پیش ازیں رسم تو بیگنه کُشی
از چه مرا نمے کشی من چه گناه کرده ام

خلق را بیدار باید بود زاب چشم من
ویں عجب کاں وقت میگریم که کس بیدار نیست

من ندا نستم از اوّل که تو بے مہر و وفائی
عہد نا بستن ازاں به که به بندی و نپائی
دوستاں عیب کنندم که چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن که چنیں خوب چرائی
گفته بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چه بگویم که غم از دل برود چوں تو بیائی

من آں نیم که حلال از حرام نشناسم
شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

اس خاصیّت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قدماء کی غزل کو ہے اس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قدماء کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے - چنانچہ اس مقام پر دو دو شعر خاقانی اور انوری کے اور ان کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں-

انوری	سعدی
روے چوں ماہِ آسماں داری	سرورامانی ولیکن سرورارفتار نیست
قد چو سروِ بوستاں داری	ماه رامانی و لیکن ماهراگفتارنیست
ایضاً	ایضاً
همه با من جفا کنند لیکن	قادری برهرچه میخواهی بجزآزار من
بجفا هیچ از و نیازارم	زاں که گرشمشیر برفرقم زنی آزارنیست

خاقانی	سعدی
بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری	ہمہ چشم تا بروں آئی
بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری	ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی

ایضاً	ایضاً
شادباش از حسن خود کز وصف تو سحر حلال	ہر دم از شاخ زبانم میوۂ تر میرسد
طبع خاقانی بنظم آورد و دیوان تازہ کرد	بوستانہا رستہ زان تخمم کہ در دل کاشتی

۶ - سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدماء کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اس کے دیوان کو نمکدان شعراً کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے -

تصوّف اور درویشی ، عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیراوئے میں ادا کرنا اور شاہد مطلق کے شیون اور صفات کو زلف و خال و خط و لب و دندان وغیرہ سے تعبیر کرنا - کاملین اور عرفا اور مشائخ پررند ، بادہ خوار ، مےفروش ، پیر خرابات وغیرہ کے الفاظ اطلاق کرنے اور ان کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا ، سلوک اور فقیری کے مدارج و مقامات یعنی صبر و رضا و تسلیم و توکّل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا ، محتسب و زاہد و فقیہہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رو سے محل ادب ہیں ، طعن و تعریض کرنی اور غیر متشرّع اور آزاد لوگ جو از روئے مذہب قابل توہین و مذّمت ہیں ، ان کی خوبی ظاہر کرنی - دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانا ، ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی ، عقل و دانش کی جا بجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اس کی تعریف کرنی ، ساقی و مطرب کو بار بار پکارنا اور ان سے شراب و نغمہ

کا اس لیے طلب گار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے فی الجملہ انقطاع میسّر آئے، باد صبا اور نسیم سحری اور بوئے گل کو اکثر مخاطب کرنا اور ان کو قاصد و پیغامبر ٹھہرا کر اپنی آرزوئیں اور مرادیں اور حسرتیں ان سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ، یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں۔ مثلاً عشق حقیقی کی واردات اور کیفیّات عشق مجازی کے پیرائے میں بیان کرنی اور زلف و خال و خط سے شاھد مطلق کی شیون اور صفات مراد لینی زیادہ دلکش اور موثّر ہیں، بہ نسبت اس کے کہ کھلی سورتھ گائی جائے۔ یعنی عشق حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنیٰ درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں:

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اسی طرح واعظ، زاھد، شیخ، قاضی، صوفی، محتسب اور اور ایسے اشخاص کو جن کی مذھب میں تعظیم کی جاتی ہے، ریاکاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے لتاڑنا اور رنود و اوباش اور حسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو ان کی صاف باطنی، آزادی اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی، بہ نسبت اس کے کہ رندوں کی ملامت کی جائے اور متشرّع لوگوں کی تعریف کی جائے، زیادہ مزیدار ہے اور زیادہ توجّہ سے سنا جاتا ہے۔

اگرچہ ان میں سے بعض عنوان جستہ جستہ قدماء کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن شیخ کے ھاں اول تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اس کے حسن بیان نے ان کو بہت بامزہ اور لطف انگیز کر دیا ہے۔ شیخ کے بعد اوّل حضرت امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی نے اس خصوصیت میں شیخ کا تتبّع کیا ہے، کیوں کہ شیخ نے

اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، سلطان میں خان شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے اپنی زندگی ہی میں بھیج دیے تھے۔ اس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری میں ترقی کرنے کے لیے ان کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ وہ اگرچہ اور اصناف سخن میں جیسا کہ مثنوی 'نہ سپہر'[1] میں لکھتے ہیں، اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے، مگر شیخ کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

خسرو سر مست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستے کہ در شیراز بود

نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانے کی غزلوں کا نام غزلیات قدیم اور جوانی اور کہولت کی غزلیات کا نام طیّبات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے، اسی طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مراتب کیے ہیں۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیوۃ، غرّۃ الکمال، بقیۂ نقیہ۔ ان قرینوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبّع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر انھیں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اول شیخ نے چمکایا تھا، مگر ان میں سے بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ انھیں کا حصّہ ہو گئے ہیں جیسے تصوّف کے

۱۔ 'نہ سپہر' کے اشعار یہ ہیں:—

کس نہ بیند سوئے نظم دل گیر
کہ نگردد بدلی منزل گیر
چون نماند بہ دل خلقے یاد
گرچہ شد زادہ ہماں داں کہ نزاد
تا بجائے کہ حد پارسیاں
اندریں عہد دوتن گشت عیاں
زاں یکے سعدی و ثانیش ہمام
ہر دو را در غزل آئین تمام
لیک اگر سوئے دگر یازی دست
شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

شراب ، اهل ظاهر پر خردہ گیری ، دنیا کی بے ثباتی ، عقل و تدبیر کی توهین ، عشق و جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ ۔ اب هم کچھ غزلیں اور اشعار شیخؒ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے هیں ، جن میں مضامین مذکورۂ بالا زیادہ تر باندھے گئے هیں :—

بر خیز تا یک سو نہیم این دلق ازرق فام را
بر باد قلّاشی دهیم این شرک تقوی نام را
مے با جواناں خوردنم خاطر تمنّا مے کند
تا کودکاں در پے فتند این پیر درد آشام را
زیں تنگنائے خلوتم خاطر بصحرا میکشد
کز بوستاں باد سحر خوش میدهد پیغام را
غافل مباش ار عاقلی در یاب اگر صاحبدلی
باشد که نتواں یافتن دیگر چنیں ایّام را
جائے که سرو بوستاں با پائے چوبیں میرود
ما نیز در رقص آوریم آں سرو سیم اندام را

وقت طرب خوش یافتیم آں دلبر طنّاز را
ساقی بیار آں جام مے مُطرب بساز آں ساز ار
امشب که بزم عارفاں از شمع رویت روشن ست
آهسته تا نبود خبر رندان شاهد باز را
روئے خوش و آواز خوش دارند هر یک لذّتے
بنگر که لذّت چوں بود محبوب خوش آواز را

جاں ندارد هر که جانا نیش نیست
تنگ عیش ست آنکه بستانیش نیست
گر دلے داری به دلدارے سپار
ضائع آں کشور که سلطانیش نیست

ما جرائے عقل پرسیدم ز عشق
گفت معزول ست و فرمانیش نیست
دردِ عشق از تندرستی خوشتر است
گر چه غیر از صبر درمانیش نیست

چناں بموئے تو آشفته ام ببوئے تو مست
که نیستم خبر از هر چه در دو عالم است
دگر بروئے کسم دیده بر نمے باشند
خلیل من همه بُت ہائے آذری بشکست
غلام همتِ آنم که پائے بند یکے ست
بجانبے متعلّق شد از هزارِ برست
نگاه من بتو و دیگراں بخود مشغول
معاشراں ز مے و عارفاں ز ساقی مست
برادران و عزیزاں نصیحتم مکنید
که اختیار من از دست رفت و تیر از شست

خوشتر از دورانِ عشق ایّام نیست
بامدادِ عاشقاں را شام نیست
مُطرباں رفتند و صوفی در سماع
عشق را آغاز هست انجام نیست
از هزاراں در یکے گیرد سماع
زانکه هر کس محرمِ پیغام نیست
هر کسے را نام معشوقے که هست
مے برد، معشوقِ ما را نام نیست
باد صبح و خاک شیراز آتشے ست
هر که او دردے گرفت آرام نیست

سعدیا چون بُت شکستی خود مباش
خود پرستی کمتر از اصنام نیست

دلے که عاشق و صابر بود مگر سنگست
زعشق تا بصبوری هزار فرسنگ ست
برادران طریقت نصیحتم مکنید
که تو به در رهِ عشق آبگینه و سنگست
دگر بخفیه نمے بایدم شراب و سماع
که نیک نامی در دینِ عاشقاں ننگ ست
چه تربیت شنوم یا چه مصلحت بینم
مرا که چشم بساقی و گوش بر چنگ ست
بخشم رفتهٔ ما را کے مے برد پیغام
بیا که ما سپر انداختیم اگر جنگ ست
بیادگارِ کسے دامنِ نسیم صباح
گرفته ایم و چه حاصل که باد در چنگ ست
بکش چنانکه تو دانی که بے مشاهده ات
فراخناے جہاں بر وجود ما تنگ ست
ملامت از دلِ سعدی فرو نشوید عشق
سیاهی از حبشی چوں رود که خود زنگ ست

دوش بے روۓ تو آتش بسرم برمیشد
آبم از دیده همی رفت و زمیں تر میشد
تا به افسوس بپایاں نرود عمر عزیز
همه شب ذکر تومی رفت و مکرّر میشد
چشم مجنون چو بخفتی همه لیلیٰ دیدے
مدعی بود گرش خواب میسّر میشد
یاربّ آں صبح کجا رفت که شبہاۓ دگر
نفسے میزد و آفاق منوّر میشد

سعدیا عقد ثریا مگر امشب بگسیخت
ورنه هر شب ز گریبان سحر بر مے شد

متقلب درون جامهٔ ناز
چه خبر دارد از شبان دراز
جهد کردم که دل بکس ندهم
چون توان کرد بادو دیدهٔ باز
محتسب در قفاے رندان ست
غافل از صوفیان شاهد باز

از تو با مصلحت خویش نمی پردازم
همچو پروانه که میسوزم و در پروازم
گر تو خواهی که بجوئی دلم امروز بجوے
ورنه بسیار بجوئی و نیابی بازم
من خراباتی و دیوانه ام و عاشق و بس
بیشتر زین چه حکایت بکند غمازم
ماجرائے دل دیوانه بگفتم به طبیب
که همه شب در چشم ست بفکرت بازم
گفت ازین نوع شکایت که تو داری سعدی
درد عشق ست و ندانم که چه درماں سازم

بر خیز تا طریق تکلف رها کنیم
دکان معرفت بد و جو پر بہا کنیم
گر دیگر آں نگار قباپوش بگزرد
ما نیز جامہائے تصوف قبا کنیم

ساقیا مے ده که ما دردے کش میخانه ایم
با خرابات آشنا و از خرد بیگانه ایم

خویشتن سوزیم و جاں برسر نہادہ شمع وار
ہر کجا در مجلسے شمعے ست ما پروانہ ایم
اہل دانش را دریں گفتار با ما کار نیست
عاقلاں را کے زیاں دارد کہ ما دیوانہ ایم
خلق میگویند جاہ و فضل در فرزانگی ست
گو مباش اینہا کہ ما رندان نافرزانہ ایم
عیب تست از چشم گوہر بیں نداری ورنہ ما
ہریک اندر بحرِ معنی گوہرِ یک دانہ ایم

دو چشم مست میگونش ببرد آرام ہشیاراں
دو خواب آلودہ بر بودند عقل از دست بیداراں
نصیحت گوئے را از من بگو اے خواجہ دم درکش
کہ سیل از سر گزشت آں را کہ مے ترسانی از باراں
چہ بوئے ست آنکہ عقل از من ببرد و صبر و ہشیاری
ندانم باغ فردوس ست یا بازار عطاراں
تو با ایں مردم کوتہ نظر در چاہ کنعانی
بمصر آتا پدید آیند یوسف را خریداراں

اے کہ ز دیدہ غائبی در دلِ ما نشستۂ
حسنِ تو جلوہ میکند ویں ہمہ پردہ بستۂ
خاطرِ عام بردۂ خونِ خواص خوردۂ
ما ہمہ صید کردۂ خود ز کمند جستۂ

مے برزند ز مشرق شمعِ فلک زمانہ
اے ساقیِ صبوحی دردہ مئے شبانہ
عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش
ہوشم ببر زمانے تا کے غم زمانہ

صوفی چگو نه گردد گردِ شراب صافی
کنجشک را نگنجد عنقا در آشیانه
آن کوزه بر کفم نه کابِ حیات دارد
هم طعمِ نار دارد هم رنگِ ناردانه
گر مے بجان دهندت بستان که پیش دانا
ز اب حیات خوش‌تر خاک شراب خانه

هر روز باد مے بَرداز بوستان گلے
مجروح میکند دل مسکین بلبلے
روےست ماه پیکرو موےست مشکبوے
هر لالهٔ که میدمد از خاک و سنبلے
بالاے خاک هیچ عمارت نکرده اند
کزوے بدیر و زود نباشد تحوّلے
مکروه طلعتے ست جهان فریب ناک
هر بامداد کرده بشوخی تجمّلے
دی بوستان خرم و صحرا و لاله زار
و ز بانگ مرغ در چمن افتاده غلغلے
و امروز خارهائے مغیلان کشیده تیغ
گوئی که خود نبود درین بوستان گلے
دنیا پلے ست رهگذر دار آخرت
اهل تمیز خانه نگیرند بر پلے

اے که آگاه نهٔ عالم درویشان را
تو چه دانی که چه سودا وسرست ایشان را
گنج آزادگی و کنج قناعت ملکے ست
که به شمشیر میسّر نه شود سلطان را

طلبِ منصب فانی نکند صاحب عقل
عاقل آنست که اندیشه کند پایان را
جمع کردند و نهادند و بحسرت رفتند
وین چه دارد که بحسرت نگزارد آن را
در ازل بود که پیمان محبّت بستند
نشکند مرد اگرش سر برود پیمان را
عاشقے سوختۂ بے سر و سامان دیدم
گفتم اے یار مکن در سر فکرت جان را
نفسے سرد برآورد و ضعیف از سرِ درد
گفت بگزار من بے سر و بے سامان را
پند دلبند تو در گوش من آید هیهات
منکه بر درد حریصم چه کنم درمان را
سعدیا عمر عزیزست بغفلت مگزار
وقت فرصت نشود فوت مگر نادان را

لا آبالی چه کند دفتر دانائی را
طاقتِ وعظ نباشد سر سودائی را
دیده را فائده آنست که دلبر بیند
ورنه بیند چه بود فائدہ بینائی را
همه دانند که من سبزۂ خط دارم دوست
نه چو دیگر حیوان سبزۂ صحرائی را
سعدیا نوبتے امشب دهل صبح نکوفت
یا مگر صبح نباشد شبِ تنهائی را

شبے و شمعے و گویندۂ و زیبائے
ندارم از همه عالم جز این تمنائے
فرشته رشک برد بر جمال مجلس من
گر التفات کند چون تو مجلس آرائے

ضرورتست بلادیدن و جفا بردن
ز دستِ آنکه ندارد بحسن همتائے
قیامت ست که در روزگار ما برخاست
به راستی که بلائے ست آں نه بالائے
دگر چه بینی اگر رو ازو بگردانی
که نیست خوشتر ازو در جہاں تماشائے
و گر کنی نظر از دور کن که نزدیکست
که سر ببازی اگر پیشتر نہی پائے

عالم که عارفاں را گوید نظر بدوزند
گر یار ما به بیند صاحب نظر بباشد
زیرا که بادشاهے چوں بقعۂ بگیرد
بنیاد حکم اول زیر و زبر بباشد
دیوانه را که گوئی هشیار باش و عاقل
ترسم که از نصیحت دیوانه تر بباشد
ساقی بیار جامے مطرب بگوے چیزے
لب بردهان نے نه تا نیشکر بباشد

ببوئے زلف تو با باد عیش‌ها دارم
اگرچه عیب کنندم که باد پیمائیست
ترا ملامت سعدی حلال کے باشد
که بر کناری و او درمیانِ دریائیست

الغرض شیخ سے پہلے تغزّل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف تھا اور عشق مجازی کے متعلق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاهری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عام عشق بازوں کی زبان پر جاری هوتی هیں ۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کم لکھی هیں ، بلکه وہ اکثر عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار و غوامض اور عمیق

کیفیات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے ، جو دل بستگی کے زمانے میں ہر انسان پر گزرتے ہیں ، لیکن ہر شخص ان کو بیان نہیں کر سکتا ، بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گزر رہا ہے ۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں اور بوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جا سکتی لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے کہ وصل کی امید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے ، جیسا کہ شیخ کہتا ہے :

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست
گر امید وصل باشد آن چنان دشوار نیست

یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند نہیں ہوتے ، وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں اور اس موقع کو یاد کر کر کے پچھتاتے ہیں ، جب کہ دل بستگی کے سامان انھوں نے خود مہیا کیے تھے اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا ربط بڑھانے سے ایک مردہ چنگاری کو زیادہ افروختہ کیا تھا ، لیکن ان کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اس جلن اور سوزش میں کس قدر لذت چھپی ہوئی ہے اور یہ کہ اگر بالفرض ترک عشق و محبت پر ان کو اختیار دے دیا جائے تو وہ ہرگز اس دل بند قید سے چھوٹنا گوارا نہیں کر سکتے ، جب کہ شیخ نے کہا ہے :

بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را
از ذوق اندرونش پروائے در نباشد

یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیر نہیں ہوتا اور جب تک وہ سامنے رہتا ہے ، عاشق اس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا ، مگر یہ بات بہت کم

خیال میں گزرتی ہے کہ عشّاق کو بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے، جیسا کہ شیخ کہتا ہے :

دل و جانم بتو مشغول ونگه بر چپ و راست
تا ندانند رقیباں که تـو منظور منی

یا مثلاً عشّاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے جب مدّت کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو وہ وقت شکوہ و شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا ہوتا ہے، مگر اس واقعی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کے ملنے کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں، چنانچہ شیخ نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے :

گفته بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چه بگویم که غم از دل برود چوں تو بیائی

غرضیکہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل معرّا تھی۔ اول شیخ نے ان مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوّف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذّت اور نمک اور درد بھر دیا، جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی، اس کے بعد اکثر متغزّلین نے وہی اصول اختیار کیے، کیوں کہ ان کے بغیر غزل کا سر سبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندوستان میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص خواجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکّہ بٹھایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا

مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے با خبر تھے ، یا
راگ راگنی سے آشنا تھے، یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے،
یا عاشق مزاج اور عیش دوست تھے ، سب جان و دل سے اس پر
قربان ہو گئے - رقص و سرود کی محفلوں میں ، حال و تال کی مجلسوں
میں ، قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں ، شعرا کی صحبتوں میں ،
مشائخ کے حلقوں میں ، در و دیوار سے ، لسان الغیب ہی کی آواز
آنے لگی -

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں
ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی ، جس کے سبب سے قدرتی جذبات
کا ایک طویل الذّیل باب یعنی عشق و محبت وغیرہ کے مضامین
نہایت آب و رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے مگر اس میں بھی کچھ
شبہ نہیں کہ اس بادۂ ہوش ربا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق ،
خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مترتّب نہ ہوئے - شعر
کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ، ایک پوشیدہ تعلق
اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع
ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے
ہیں وہ اندر ہی اندر جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ
جماعت کو اصلاً شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن
زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کی تاثیر جلد اور پائدار ہوتی ہے -
شیخ سعدی ، خواجہ حافظ ، امیر خسرو ، میر حسن سجزی ،
مولانا جامی وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا
ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصے میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں-
اگرچہ ان بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف اور سلوک
اور تصوّف پر مبنی ہے ، لیکن اس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو
موجود ہیں - جس طرح اس سے ایک صوفی خدا پرست روحانی کیفیت
اٹھاتا ہے ، اسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات

اس کے سننے اور پڑھنے سے بر انگیختہ ہوتے ہیں - سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں - وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے - عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے - مال و دولت ، علم و ہنر ، نماز روزہ ، حج زکواۃ، زہد و تقویٰ غرضیکہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی - وہ عقل و تدبیر ، مآل اندیشی ، تمکین و وقار ، ننگ و ناموس ، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذّمت کرتی ہے اور آوارگی، رسوائی، بدنامی، بدمستی، بے سرو سامانی وغیرہ کو جو عشق کی بدولت حاصل ہو ، تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے - دولت دنیا پر لات مارنا ، عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا ، توّکل اور قناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دنیا وما فیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصوّر باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجاب اکبر جاننا ، حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا ، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا اور جو کچھ ہاتھ لگے اس کو فوراً رائگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں - ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالّطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رّقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے ان کو لے اڑتی ہے اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں، جن کی تمام عمر حقائق و معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جن کا شعر شریعت کا ُلب ّ لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے ، تو یہ مضامین اور بھی

زیادہ دل‌نشین ہوتے ہیں - پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اس کے متّبعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو - اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو اکثر ان صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اس مجموعۂ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے - عشق بازی ، حسن پرستی ان کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولت مند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اس کا چسکا رکھتے ہیں اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمّر لوگ بھی اس کا دم بھرتے ہیں - فضول خرچی ، نا عاقبت اندیشی ، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا ، توکّل اور قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنی ، غیر قوموں کی ترقی کا ذکر سن کر دنیا و ما فیہا کو ہیچ و پوچ بتانا ، عقل انسانی کو حقائق اشیاء کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا، وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیّتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں - اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیّتیں اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں ، شاید اس کے اصلی سبب کچھ اور ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوّفانہ اشعار نے اس حالت کے ترقی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے -

سٹیون صاحب نے جو کلکتہ ریویو مورخہ جون سنہ ۱۸۵٦ء میں خواجہ حافظ کا حال لکھا ہے ، اس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے ، جس کا نقل کرنا اس مقام پر شاید بے موقع نہ ہوگا - وہ لکھتے ہیں کہ :-

''سعدی جو کہ حافظ کا چچا ہے، ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا ، جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا ، اتفاقاً اسی وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا - حافظ نے

اس مصرعے پر دوسرا مصرعہ لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ کر وہاں چھوڑ دی۔ . . . اور آپ چل دیا ۔ شیخ نے پھر وہاں آ کر حافظ کو نہ پایا مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی ۔ سعدی اس بات سے نا خوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے ؟ اس نے کہا ہاں ۔ شیخ نے اس سے ساری غزل پوری کرائی اور جب وہ غزل سنی تو اس کو بد دعا دی کہ جو شخص تیری غزل پڑھے گا وہ عقل سے بیگانہ رہے گا ''۔

اس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعی مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بے شک سعدی کی بد دعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی ، کیوں کہ اس کے ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ :۔

''یہ حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے''۔ میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے ، کیوں کہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا آگا پیچھا ہے[1]۔ قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی مُمارست اور مُزاولت سے بے شک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکّل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش و الواط کو بے فکری ، ناعاقبت اندیشی ، عشق بازی ، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی

---

۱ - سعدی کا انتقال ۶۹۱ ہجری (مطابق ۱۲۹۲ء) میں ہوا اور حافظ کی وفات ۷۹۲ ہجری (مطابق ۱۳۸۹ء) میں ہوئی ۔ (اسماعیل پانی پتی)

موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری ۔ ہر زمانے کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دولت‌مند اور ذی‌اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حُبّ جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرّتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطّل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں ، اس وقت البتہ یہ امید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبوں سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو ، لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہو گئی ہو اور اولوالعزمی کا تخم ان کی طبیعت میں جل گیا ہو اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجّہ ہوں ، اس وقت دنیا سے ان کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکّل کا ان کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اس کو گل کر دینا ۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اس کے متّبعین کی غزل نے اس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشۂ جاہ دنیوی عروج پر تھا کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہوں ، لیکن اس زمانے میں میرے نزدیک اس سے ضرر کا اندیشہ ہے ۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اس سے ان کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے ۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہے اس سے لوگ متاثر ہوں ، نہ یہ کہ اس سے کبھی مضر نتائج پیدا نہ ہونے پائیں۔ باروت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقاً اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں ، با ایں ہمہ ان کے موجدوں کی دانش مندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی ۔

قصائد وغیرہ

اِس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قیصدے ، مرثیے، ترجیع بند ، مُلمع اور مثلّث جمع کیے گئے ہیں ۔ یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے ۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی ، یا تو اس کی طبیعت ہی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گوں نہ تھی ،اور یا اس نے مدح و ستائش کے طریقۂ مروّجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا ، مگر چونکہ اس زمانے کے دستور کے مواقق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا کچھ نہ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا ، اس لیے اس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں ۔

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مدّاحی کی مسلمانوں میں تھی ، اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں محل نہیں ہے ، مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عبّاسی خلیفۂ بغداد کے زمانے سے شعراء کو نہایت گرانبہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے ۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درھم شاعروں کو مل جاتے تھے ۔ خلفا اور امراء کو اپنی تعریفیں سننے کا ایسا شوق ہو گیا تھا کہ ان کا مدّاح کسی اور شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو ان کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر شاعر تشبیب میں زیادہ شعر لکھ لاتا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال و خط کی تعریف میں خرچ کر دیتے ہیں ، صرف کچھ بچے کھچے خیالات ہمارے سر مارتے ہیں ۔ ہزاروں علماء و فضلا

نے قصیدہ گوئی اور مدّاحی کو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا تھا اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی نہ کرے ۔ شعراء تمام ممالک اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے ۔ عبّاسیوں کے علاوہ فاطمی ، دیلمی ، کُردی ، طاہری ، صفاری ، سامانی ، غزنوی ، سلجوقی ، خوارزم شاہی وغیرہ تمام سلسلوں میں مدّاحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی ۔ ایران میں بھی سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد ہی کا زور شور رہا مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ‌تر فارسی زبان پر آ ٹھہرا ۔ فارسی قصیدے نے بھی خوب رواج پایا ۔ ظہیر ، رشید ، خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں مُتنبّی ، ابوتمّام ، بحتری اور ذوالرمہ نے حاصل کی تھی ۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امرائے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور تہوار میں نذر دکھانا ، مگر قصیدہ کی حالت اس وقت ایسی بری تھی کہ شیخ کو اپنی جبّلی استقامت اور سنجیدگی کے سبب اس روش پر چلنا دشوار تھا ۔ ممدوح کی ستائش میں سراسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کیے جاتے تھے ، الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی تھی ، مسائل علمیّہ اور مقدّمات حکمیّہ اور سلوک و تصوّف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی اصطلاحیں اظہار علم و فضل کےلیے ان میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں ، صنائع لفظی خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو ان کا زیور سمجھتے تھے ۔ شیخ کی آزادی اور حق گوئی خصوصاً سادہ بیانی جو اس کی طبیعت میں

ودیعت کی گئی تھی ، ان تکلّفات لا یعنی سے مانع تھی ۔ اس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغے اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا ۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے :-

نُہ کرسیِ فلک نہد اندیشہ زیر پاے
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

شیخ بوستان میں جہاں اتابک ابوبکر سعد کی تعریف لکھتا ہے، وہاں ظہیر کے اس شعر پر اس طرح تعریض کرتا ہے ۔

بہ راہ تکلّف مرو سعدیا | اگر صدق داری بیارو بیا
تو منزل شناسی و شہ راہرو | تو حق گو و خسرو حقائق شنو
چہ حاجت کہ نُہ کرسیِ آسماں | نہی زیر پائے قزل ارسلاں
مگو پائے عزّت بر افلاک نہ | بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

اس کے سوا اور اکثر جگہ اس نے مدّاح پیشگی سے نفرت اور اعراض ظاہر کیا ہے ۔ اس کے ایک قطعے کا مضمون یہ ہے کہ "لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو کیوں سختیاں اٹھاتا ہے اور کیوں اپنے کمال شاعری سے متمتّع نہیں ہوتا ؟ اگر تو مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے ، مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازے پر اپنا مطلب دریوزہ گروں کی طرح لے جاؤں ۔ اگر ایک جَو بھر ہنر کے عوض میں کوئی مجھ کو سو خزانے بخش دے تو وہ مستحق شکر ہے اور میں قابل نفرین"۔

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغے اور خوشامد سے نفرت تھی ، کوئی ضرورت بھی ایسی داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور قصیدہ گوئی کا جو اس وقت کمال سمجھا جاتا تھا ، اس کے

حاصل کرنے میں مقتضائے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا ۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفّر رہتا تھا اور اپنے دوستوں کو اس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اس کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ قصیدے کو مقبول خاص‌وعام بنائے اور اس ذریعے سے دربار میں تقرّب حاصل کرے ۔ جتنے نامی قصیدہ‌گو ایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ تقریبوں میں طوفان کے تودے بنا کر لائیں اور ان میں جس قدر زیادہ مبالغے اور جھوٹ کو کام فرمائیں اسی قدر گرانبہا صلے اور انعام پائیں ۔ چنانچہ ظہیر قزل ارسلان کے ہاں ، انوری سلطان سنجر کے ہاں، رشید وطواط خوارزم شاہ آتسنر کے ہاں اور خاقانی شر و انشاہ کے ہاں ملک الشّعرأ تھے۔ ان لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوتی تھی اور ان کی ترقّی اور تقرّب کا مدار صرف ان باتوں پر تھا جو اس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں ۔ یہی سبب ہے کہ قصیدے کے سوا کوئی بڑی یادگار انھوں نے نہیں چھوڑی ۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اس زمانے کے دستور کے موافق کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا ، لیکن اس کو ویسے جھوٹے اور نمائشی طلسم باندھنے کچھ ضرور نہ تھے ، جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں ۔ اسی لیے غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا ۔ میں ہرگز اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس کو معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی ، بلکہ میرے نزدیک جس طرح رُولر ٹیڑھا خط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اسی طرح طبیعت کی استقامت کبھی بے راہ نہیں چلنے دیتی ۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ حدّ شاعری سے متجاوز ہو گیا ہے ایسی اور کوئی صنف نہیں ہوئی ، مدحیہ قصائد

سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات سن کر خاص و عام کے دل میں اس کی محبت اور اس کے ساتھ حسن ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ اگر وہ صفتیں اس میں موجود ہوں تو ان میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم ان کو اسی حال پر قائم رکھے اور اگر نہ ہوں تو ان کے حاصل کرنے میں کوشش کرے ۔ یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات مدح میں ذکر کی جائیں، وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی‌الواقعہ موجود ہوں یا ان کے موجود ہونے کا احتمال ہو ۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اس مدح کی وقعت ایک ہجوِ ملیح سے زیادہ نہ ہوگی ۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلان کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ ”تصور جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے تب جا کر قزل ارسلان کی رکاب پر بوسہ دیتا ہے“۔ اس سے قزل ارسلان کے دل پر اس کے سوا کہ اس کو ایک ہجوِ ملیح سمجھا ہو اور کیا اثر ہوا ہوگا ۔ یا مثلاً انوری جو مجدالدّین ابو الحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ ”اگر وہ زمانۂ گزشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانۂ آئندہ کی جگہ آ جائے“۔ اس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اس کے کہ مدّاح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خاکا اُڑاتا ہے اور کیا خیال گزرا ہوگا ۔ یہی حال ان تمام قصیدہ گویوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندوستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے ۔ شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فرط کراہت کے سبب مدح و ستائش کے اس نا پسندیدہ طریقے کو اختیار نہیں کیا ۔ اس نے قصائد بھی اپنی اسی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بے تکلّفی کے ساتھ جو کہ اس کے کلام کی عام خاصیّت ہے لکھے ہیں ۔ اس کے قصائد سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے ۔ اس نے اکثر قصیدے اور ترجیع بند وغیرہ محض محبت اور خلوص اور دلی جوش سے لکھے ہیں ۔ نہ خوشامد کی راہ سے، اور نہ صلۂ و انعام کی آمید پر ۔ باقی جس قدر

قصیدے بضرورت سلاطین عہد اور حکّام وقت کی شان میں لکھے ہیں ان کے اسلوبِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اہل دنیا کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لیے قصیدے کو ان سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا ، کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں - بعض قصیدوں میں پند و اندُوز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں ہیں ، یہ وہ قصیدے ہیں جو اس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نامزد کیے ہیں - ان کے سوا اور قصیدوں میں اول مدح و ستائش کی چاٹ دے کر پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے -

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اس کی علّت غائی جو اس نے قرار دی تھی ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے -

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اس کی رعایا میں سے تھا ، اس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے :

بنوبت اند ملوک اندریں سپنج سرائے
کنونکہ نوبتِ تُست اے ملک بعدل گرائے
چہ مایہ بر سرِ ایں ملک سروراں بودند
چو دورِ عمر بسر شد در آمدند از پائے
نیاز باید و طاعت نہ شوکت و ناموس
بلند بانگ چہ سود و میان تہی چودرائے
بہ تیغ و نیزہ گرفتند جنگجویاں ملک
تو برو بحر گرفتی بعدل و ہمت و رائے
چو ہمت ست چہ حاجت بہ گُرز مغفر کوب
چو دولت ست چہ حاجت بہ تیر جوشن خائے
عمل بیار کہ رختِ سرائے آخرت ست
نہ عود سوز بکار آیدت نہ عنبر سائے

هر آں کست کہ بہ آزار خلق فرماید
عدوے مملکت ست آں بکشتنش فرماے
بکامۂ دل دشمن نشنید آں مغرور
کہ بشنوو سخن دشمناں دوست نماے
دیار مشرق و مغرب بگیرو جنگ مجوی
دلے بدست کن و زنگ خاطر بزداے
نگویمت چو زباں اوراں رنگ آمیز
کہ ابر مشک فشانی و بحر گوھر زاے
نکاھد انچہ نوشتہ ست عمر و نفزاید
پس ایں چہ فائدہ گفتن کہ تا بہ حشر بپاے

دوسرے قصیدے میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اتابک ابوبکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے :

مدیح شیوۂ درویش نیست تا گویم
کہ همچو بحر محیطی و ابرآذاری
نگویمت کہ بفضل از کرام ممتازی
نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری
وگرچہ ایں همہ هستی نصیحت اولی تر
کہ پندراہ خلاص ست ودوستی یاری
بسعی کوش کہ ناگہ فراغتت نبود
کہ سر بخاری، اگر روئے شیر نرخاری
خدائے یوسف صدیق راعزیز نہ کرد
بخوبروئی و لیکن بخوب کرداری
شکوہ لشکر و جاہ و جلال و مالت هست
و لے بکار نیاید بجز نکو کاری
بقائے مملکت اندر وجود یکحرف ست
کہ دست هیچ قوی برضعیف نگماری
پس از گرفتن عالم چو کوچ خواھد بود
رواست گر همہ عالم گرفتہ انگاری
بہ نیک و بد چو بباید گزشت آں بہتر
کہ نام نیک بدست آوری و بگزاری
هزار سال نگویم بقائے عمر تو باد
کہ ایں مبالغہ دانم زعقل نہ شماری
همیں سعادت و توفیق بر مزیدت باد
کہ حق گزاری و ناحق کسے نیازاری

اتابک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ جو اتابکوں کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ گزرا ہے اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا

گیا، اس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے :

مراد سعدی ازانشاد و زحمت خدمت
نصیحت ست بسمع قبولِ شاهنشاه
دوام دولت و آرام مملکت خواهی
ثبات راحت و امن مزید رفعتِ جاه
کمر بطاعت و انصاف و عدل وعفو به‌بند
چو دستِ رحمتِ حق بر سرت نهاده کلاه
تو روشن آئینهٔ ز آهِ درد مند به ترس
عزیز من! که اثر میکند در آئینه آه
معلّمانِ بد آموز را سخن مشنو
که دیر سال بمانی بکام نیکی خواه

ایل خاں[1] یعنی ہلاکو خاں یا اس کے بیٹے اباقا خاں کی شان میں جن کی ہیبت سے روم و روس و چین کے بادشاہ لرزتے تھے، مدحیہ اشعار لکھ کر کہتا ہے :

هر نوبتے نظر به یکے میکند سپهر
هر مدّتے زمیں به یکے میدهداماں
بیخے نشاں که دولت باقیت بر دهد
کایں باغ عمر گاه بهار ست و گه خزاں
اے بادشاهِ روۓ زمیں دور ازاں تست
اندیشهٔ تقلّبِ دوراں کن و زماں
چوں کام جاوداں متصوّر نمی شود
خرّم کسے که زنده کند نام جاوداں
ناداں که بخل میکند و گنج مے نهد
مزدورِ دشمن ست تو بر دوستاں فشاں

۱ - ایل خاں کا اطلاق تاتار کے اکثر خوانین پر ہوتا ہے -

یارب توهرچه رائے صواب ست وفعل خیر
اندر دلِ وے افگن و بر دست وے بران
آهوئے طبع بنده چنیں مشک میدهد
کز پارس می برند بتاتارش ارمغان

سردار انکیانو جو خاندان اتابک کے زوال کے بعد سلطان اباقا خاں پسر هلاکو خاں کے حکم سے فارس کا فرمانروا مقرر هوا تھا اور اپنے قدیم تاتاری مذهب پر نہایت پختگی سے ثابت قدم تھا ، اس کی شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے هیں ان میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج هے ۔ از آنجمله ایک قصیدے میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھتا هے :-

حرامش باد ملک و پادشاهی | که پیشش مدح گویند از قفاذم
عروسِ زشت زیبا کے تواں کرد | و گر بر خود کند دیبائے مُعلم
اگر مردم همیں بالاوریش اند | به نیزه نیزه بر بسته ست پرچم
چنیں پند از پدر نشنیده باشی | الا گر هوشیاری بشنو از عم
چو یزدانت مکرّم کرد و مخصوص | چناں زی درمیان خلق عالم
که گر وقتے مکاں پادشاهیت | نباشد ، هم چناں باشی مکرّم
نه هر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکے ست سعدی را مسلّم
مقامات از دو بیروں ست فردا | بهشتِ جاودانی یا جهنم ۔

سلجوق شاه جس کا اوپر ذکر هو چکا هے ، اس کی مدح کو ایک اور قصیدے میں اس طرح ختم کیا هے ۔

جهاں نماند و آثار مملکت ماند | بخیر کوش وصلاح وبعدل کوش و کرم
که ملک و دولت ضحاک بے گنه آزار | نماند و تا به قیامت برو بماند رقم
خطائے بنده نگیری که مهتراں و ملوک | شنیده اند نصیحت ز کهتران خدم
خنک کسے که پس از وے حدیث خیر کنند | که جز حدیث نمے ماند از بنی آدم

ان کے سوا جو قصیدے خواجہ شمس الدّین جوینی صاحب دیوان اور اس کے بھائی خواجہ علاؤ الدّین جوینی اور مجد الدّین رومی اور فخر الدّین ابوبکر وغیرہم کی مدح میں لکھے ہیں ان میں بھی اکثر مدح برائے نام ہے ، زیادہ تر نصیحت و پند ہے - اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں ، ان میں صرف نصائح و مواعظ یا فصل بہار کا سماں یا معشوق کی تعریف یا حمد الٰہی وغیرہ مندرج ہے -

ایک مختصر قصیدہ اول سے آخر تک بھی اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مدح اور نصیحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو :-

مدح و موعظۂ مجد الدین رومی

جہاں بر آب نہادہ ست وزندگی برباد | غلام ہمت آنم کہ دل برو ننہاد
جہاں نماند و خرم روان آدمئے | کہ باز ماند از و در جہاں بہ نیکی یاد
سرائے دولت باقی نعیم آخرتست | زمین سخت نگہ کن چو می نہی بنیاد
کدام عیش درین بوستان کہ باد اجل | ہمے بر آورد از بیخ قامت شمشاد
حیات عاریتی خانہ ایست در رہ سیل | چراغ عمر نہادہ است بر دریچۂ باد
بسے بر آید و بے ما فرو شود خورشید | بہار گاہ خزاں باشد و گہے مرداد
بر آنچہ میگزرد دل منہ کہ دجلہ بسے | پس از خلیفہ بخواہد گزشت در بغداد
گرت زدست بر آید چو نخل باش کریم | ورت بدست نباشد چو سرو باش آزاد
بسے بدیدۂ حسرت ز پس نگاہ کند | کسے کہ برگ قیامت ز پیش نفر ستاد
وجود خلق بدل میکنند ورنہ زمیں | ہماں ولایت کیخسرو است و ملک قباد
چو طفل بر ہمہ بازید و بر ہمہ خندید | عجب تر آنکہ نگشتند دیگراں استاد
عروس ملک نکو روئے دختریست ولے | وفا نمیکند ایں سست مہر با داماد
نہ خود سریر سلیماں بہ باد رفتے و بس | کہ ہر کجا کہ سریریست میرود برباد

همیں نصیحت من گوشدار و نیکی کن | که دانم از پس مرگم کنی به نیکی یاد
نداشت چشم بصیرت که گرد کرد و نخورد | ببرد گوئے سعادت که صرف کرد و بداد
چنانکه صاحب فرخنده رائے مجد الدّین | که بیخ اجر نشاند و بنائے خیر نهاد
نگویمت به تکلف فلان دولت و دین | سپهر مجد و معالی جهان دانش و داد
تو آن برادر صاحب دلی که مادر دهر | به سالها چو تو فرزند نیکبخت نه زاد
به روزگار تو ایّام دست فتنه ببست | به یمن تو در اقبال بر جهان بکشاد
دلیل آن که ترا از خدائے نیک آید | بس ست خلق جهان را که از تو نیک افتاد
یکے دعا کنمت بے رعونت از سر صدق | خدات در نفس آخریں بیامرز زاد

تو هم زباں نه کنی گر بصدق دل گوئی
که آفرین خدا برروان سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد[1] بن بوبکر کے مرثیے میں لکھے ھیں اور جو کلّیات میں غلطی سے امیر فخر الدّین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ھے ، بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ھیں -

---

۱ - امیر فخر الدین ابو بکر ، اتابک ابو بکر کے امرائے نامدار میں سے تھا جو ادنیٰ درجے سے منصب امارت بلکہ مشارکت ملک تک پہنچا تھا اور سعد بو بکر اتابک کا بیٹا تھا - جس زمانے میں ھلاکو خاں نے بغداد کو فتح کیا تھا ، ابو بکر نے اپنے بیٹے سعد بو بکر کو اظہار دوستی و خیر خواھی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا - جب وھاں سے با اعزاز تمام رخصت ھوا تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سنی ، جس سے اور ولی عہدوں کی طرح اس کو خوش ھونا چاھیے تھا مگر اس کو اس خبر سے ایسا صدمہ ھوا کہ راہ ھی میں سخت بیمار ھو گیا اور رستے ھی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا - اس کی سناؤنی جب شیراز میں آئی ھے تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ھے جیسا کہ ترجیع بند کے شعر سے ظاھر ھے - سعد کے بعد اس کا بیٹا محمد مظفر اس کا جانشین ھوا -

غریباں‌را دل ازبہرِ تو خون ست | دل خویشاں نمیدانم که چون ست
عنانِ گریه چوں شاید گرفتن | که از دست شکیبائی برون ست
مگر شاهنشه اندر قلبِ لشکر | نمی آید که رایت سرنگون ست
شکیبائی مجو از جانِ مہجور | که بار ازطاقتِ مسکیں فزون‌ست
سکوں در آتشِ سوزنده گفتم | نشاید کرد ، ودرماں هم‌سکون‌ست
که دنیا صاحبے بد عہد وخونخوار | زمانه مادرے بےمہر و دون ست
نه اکنون ست بر ما جورِ ایام | که از دورانِ آدم تا کنوں ست

نمے دانم حدیثِ نامه چون ست
همے بینم که عنوانش بخون ست

بزرگاں چشم و دل در انتظارند | عزیزاں وقت وساعت می شمارند
غلاماں دُرّ و گوهر مے فشانند | کنیزاں دست و ساعد مے نگارند
ملک خان‌و مناق و بدر و ترخاں | به رهوارانِ تازی بر سوارند
که شاهنشاهِ عادل سعد بوبکر | به ایوانِ شهنشاهی در آرند
حرم شادی کناں‌برطاق و ایواں | که مرواريد بر تاجش ببارند
زمیں‌مے گفت عیشے‌خوش‌گزاریم | ازاں پس آسماں گفت ار گزارند
امید تاج و تختِ خسروی بود | ازیں غافل که تابوتش در آرند
چه شد پاکیزه رویانِ حرم را | که بر سرگاه و بر زیور غبارند
نشاید پاره کردن زیور و روے | که مردم تحتِ امرِ کردگارند
و لیکن با چنیں داغِ جگر سوز | نمے شاید که فریادے ندارند
بلے شاید که مہجوراں بگریند | روا باشد که مظلوماں بزارند

نمے دانم حدیثِ نامه چون ست
همے بینم که عنوانش بخون ست

پس ازمرگِ جواناں‌گل مما ناد | پس از گل در چمن بلبل مخوا ناد
کس اندر زندگانی قیمت دوست | نداند ، کس چنیں قیمت مداناد
سر آمد روزگارِ سعدِ بوبکر | خداوندش به رحمت در رساناد
به تلخی رفت از دنیاے شیریں | زلال کام در حلقش چکاناد

جزاے مردہ رفتن در غریبی
شراب از دستِ پیغمبر ستاناد
دریں گیتی مُظفّر شاہ عادل
محمّد نام برادرش بماناد
سعادتِ پرتوِ نیکاں دہادش
بخوئے صالحانش پروراناد
روانِ سعد را با جانِ بوبکر
بہ اوجِ روح و راحت گستراناد
بکامِ دوستان و بختِ فیروز
بسے دورانِ دیگر بگزراناد

نمے دانم حدیثِ نامہ چون ست
ھمے بینم کہ عنوانش بخون ست

صاحبیّہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرّق اشعار کا سو صفحے کے قریب ھے جس میں قطعہ ، رباعی ، فرد ، مُلمع ، مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ھیں - چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدّین حسین صاحبِ دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اس لیے شیخ نے اس مجموعے کا نام صاحبیّہ رکھا ھے -

ان اشعار میں کوئی نئی خصوصیّت ایسی نہیں ھے جس کا ذکر کیا جائے ، بیشتر اشعار نصیحت و پند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ھیں - چند قطعے اور رباعیاں جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں ، نقل کی جاتی ھیں -

قطعات

تفرّسِ ناکساں

ناکساں را فراستے ست عظیم
گر چہ تاریک طبع و بد خویند
چوں دو کس مشورت کنند بہم
گوید ایں عیب من ھمی گویند

خصائلِ سگاں

سگے شکایتِ ایّام با یکے مے گفت | نه بینیم که چه بر گشته‌حال و مسکینم
نه آشیانه چو مرغان نه غلّه چون موران | قناعتم صفت و بردباری آئینم
گرم دهند خورم ورنه میروم آزاد | نه همچو آدمیان خشمناک بنشینم
مرا نه برگِ زمستان نه عیشِ تابستان | کفایت ست همیں پوستین پارینم
هزار سنگ بریں جانِ بیگنه بخورم | که اوفتاده نه بینی برابرِ رواں چینم
نه در ریاضت و خلوت مقام مے سازم | که جائگاهِ کلوخ ست وسنگ بالینم
به لقمهٔ که تناول کنم ز دست کسے | رواست گر بزند بعد ازاں به ژو پینم
چو گربه درنه ربایم زدستِ مردم چیز | ور اوفتاده بود ریزه ریزه بر چینم
بجائے من که نشیند که در مقامِ رضا | برابر ست گلستان و تلِّ سرگینم
مرا که سیرت ازیں جنس و خوبدیں صفت ست | چه کرده‌ام که سزاوار سنگ و نفرینم
جواب داد کزیں بیش نعت خویش مگو | که خیره گشت ز وصفت زبان تحسینم
همیں دو خصلتِ ملعون کفایتت که ترا | غریب دشمن و مُردار خوار مے بینم

ضرورتِ ملاعبت بعد از مشقّت

نظر کردم بچشمِ رائے و تدبیر | ندیدم به ز خاموشی خصالے
نگویم لب به بند و دیده بر دوز | و لیکن هر مقامے را مقالے
زمانے بحثِ علم و درس و تنزیل | که باشد نفسِ انساں را کمالے
زمانے شعر و شطرنج و حکایات | که خاطر را بود دفع ملالے
خدا یست آں که ذات بے مثالش | نگردد هرگز از حالے بحالے

همدردی بنی نوع

رَحِمَ اللهُ مَعْشَرَ الْمَاضِیْن | که به مردی قدم سپردندے
راحتِ نفسِ بندگانِ خدائے | راحتِ جانِ خود شمردندے
آں عزیزاں چو زنده مے نشوند | کاش ایں ناکساں بمردندے

انجامِ ظالمان

بس دستِ دعا بر آسمان بود — تا پاے برآمدت به سنگے
اے گرگ نه گفتمت که روزے — تا گه به سر افتدت پلنگے

حقوقِ پدران

اے طفل که دفع مگس از خود نتوانی — هر چند که بالغ شدی آخر نه همانی
شکرانهٔ زور آوریِ روزِ جوانی — آنست که قدرِ پدرِ پیر به دانی

شانِ رزّاق

صانعِ نقشبندِ بے مانند — که همه نقش اونکو آید
رزقِ طائر نهاد در پرو مال — که بهر طعمهٔ فرود آید
روزیٔ عنکبوت را به مگس — پر دهد تا به نزد او آید

ولیِ خائن به یتیمان

الحق آشنائے مال ایتام — همچون تو هلال زاده یابند
هر گز زن و مردِ کفر و اسلام — نفس از تو پلید تر نه زایند
طفلان ترا پدر بمیراد — تا جورِ وصی بیاز مایند
اطفالِ عزیزِ ناز پرورد — از دستِ تو دست بر خدا ایند

ظالم محتاط در حقِ خود

امیر ما عسل از دست خلق می نخورد — که زهر در قدح انگبین تواند بود
عجب که در عسل از زهر میکند پرهیز — حذر نمیکند از تیرِ آهِ زهر آلود

ترحّم بر بیوگان

شنیدم که بیوه زنے دردمند — همیگفت ورخ بر زمین مے نهاد
هر آن کدخدا را که بر بیوه زن — ترحّم نباشد زنش بیوه باد

منعِ دشنام

هر بد که بخود نمے پسندی | با کس مکن اے برادرِ من
گر مادرِ خویش دوست داری | دشنام مده به مادرِ من

مدافعتِ دشمن

مقابلت نکند با حجر به پیشانی | مگر کسے که تہوّر کند بنادانی
کس این خطانه‌پسندد که دفعِ دشمنِ خود | توانی و نکنی یا کنی و نتوانی

مطائبه

شنیده ام که فقیہے به دشتبانے گفت
که هیچ خربزه داری رسیده گفت آرے
ازیں طرف دو به دانگے، گر اختیار کنی
وزآں ، چہار به دانگے قیاس کن بارے
سوال کرد که چندیں تفاوت از پے چیست
که فرق نیست میانِ دو نوع بسیارے
بگفت از آنچه تو بینی حلال و ملکِ من ست
نیامده ست بدستم بوجه آزارے
و زاں دگر پسرانم بغارت آوردند
حرام را نبود نزدِ شرع مقدارے
فقیه گفت ، حکایت دراز خواهی کرد
از حرامترت هست صد به دینارے

امتحان دوستی

تا سگاں را وجوه پیدا نیست | مشفق و مہربان یک دگرند
لقمۀ درمیانِ شان انداز | که تہی گاهِ یک دگر بدرند

رباعیات

پاس عہد

شب نیست کہ چشمم آرزومند تو نیست | ویں جاں بہ لب رسیدہ در بند تو نیست
گر تو دگرے بجائے من بگزینی | من عہد تو نشکنم کہ مانند تو نیست

تاسّف بر عمر گزشتہ

ماہیّ امید عمرم از شست برفت | بے فائدہ روزم چو شب مست برفت
عُمرے کہ ازو دمے بجائے ارزد | افسوس کہ رائگانم از دست برفت

انجام ظالم

از بس کہ بیازرد دل دشمن و دوست | گوئی بگناہ مسخ کردندش پوست
وقتے غم او برہمہ دلہا بودے | اکنوں ہمہ غمہائے جہاں بر دل اوست

فضل دوست بر ہمہ چیز

گویند ہوائے فصل آذار خوش ست | بوئے گل و بانگ مرغ گلزار خوش ست
ابریشم زیر و نالۂ زار خوش ست | اے بے خبراں این ہمہ با یار خوش ست

مجبوری عاشق

گویند مرو در پے آں سرو بلند | انگشت نمائے خلق بودن تاچند
بے فائدہ پندم مدہ اے دانشمند | من چوں نروم کہ مے برندم بہ کمند

خوف مرگ

آہو برہ را کہ شیر در پے باشد | بے چارہ چہ اعتماد بروے باشد
ایں ملح در آب چند بتواند بود | ویں برف در آفتاب تا کے باشد

توحید

آن را که نظر بروئے هر کس باشد | در دیدهٔ صاحب نظران خس باشد
قاضی به دو شاهد بدهد فتویٔ شرع | در مذهب عشق شاهدے بس باشد

ریاضت کشان

مردان همه عمر پاره بر دوخته اند | قوتے بهزار حیله اندوخته اند
فردائے قیامت بگناه ایشان را | باشد که نسوزند که خود سوخته اند

مطائبه

با دوست بگرما به درم خلوت بود | و آن روئے گلینش گِل حام آلود
گفتا دگر این روئے کسے دارد دوست؟ | گفتم بگِل آفتاب نتوان اندود

غرور حسن

چون صورت خویشتن در آئینه بدید | وآن کام و دهان و لب و دندان بگزید
مے گفت چنان که میتوانست شنید | بس جان بلب آمد که بدین لب نه رسید

انتظار

امشب نه بیاض روز بر می آید | نه نالهٔ مرغان سحر می آید
بیدار نشسته ام نظر بر سر کوه | تا صبح که از سنگ بدر می آید

فصل خزان

وقتست که چشم فتنه خوابش ببرد | باد از رخ گل حسن شبابش ببرد
گل وقت رسیدن آب عطار ببرد | عطار بوقت رفتن آبش ببرد

فصل بهار

وقت گل و روز شادمانی آمد | هنگام نشاط و کامرانی آمد
آن شد که به سرما نتوانی آمد | سرما شد و وقت مهربانی آمد

عظمتِ عاشق و معشوق

ما چاکرِ آنیم که دل بر باید | یا دل به کسے دهد که جان آساید
آنکس که نه عاشق و نه معشوق کس ست | در مُلکِ خدا اگر نباشد شاید

بے ثباتیِ زندگی

آن گُل که هنوز نو بدشت آمده بود | نشگفته تمام ، باد مهرش بربود
بیچاره بسے امید در خاطر داشت | امید دراز و عمر کوتاه چه سود

حسرت

من دوش قضا یار و قدر پشتم بود | نارنج زنخدان تو در مُشتم بود
دیدم که همے گزم لبِ شیرینت | بیدار چو گشتم سر انگشتم بود

صلح باد دشمنِ قوی

چون خیلِ توصد باشدو خصمِ توهزار | خود را بهلاک می سپاری زنهار
تا بتوانی بر آور از خصم د مار | چون جنگ ندانی آشتی عیب مدار

ناگزیر بودنِ معشوق

نامردم اگر زنم سر از مهر تو باز | خواهی بکشم بجور و خواهی بنواز
ور بگریزم زدستت اے مایهٔ ناز | هر جا که روم پیش تو مےآیم باز

صدقِ طلب

تا سر نکنم درسرت اے مایهٔ ناز | کوته نکنم ز دامنت دستِ نیاز
هرچند که راهم بتو دور است ودراز | درراه بمیرم و نگردم ز تو باز

خوبرویان را دوست داشتن

گر بے خبران و عیب گویان از پس | منسوب کنندم به هوا و به هوس
آخر نه گناه ست که من کردم و بس | منظور ملیح، دوست دارد همه کس

حفظِ جان از مهالک

چون زهرهٔ شیران ببرد نعرهٔ کوس | بر باد مده جانِ گرامی بفسوس
با آنکه خصومت نتوان کرد، بساز | دستے که بقوّت نتوان برد ببوس

معاملت با دوست

یا همچوهماے برمن افگن پرِ خویش | تا بندگیت کنم بجان و سرِ خویش
ور لائقِ خدمتم ندانی برِ خویش | گومن سرِ خویش گیرم و کشورِ خویش

همسائیگیِ نیکاں و بداں

همسایه که میلِ طبع باشد سویش | فردوس برین بود سرا در کویش
وآنرا که نخواهی که به بینی رویش | دوزخ باشد بهشت در پهلویش

حسرتِ جوانی در پیری

هر سروقدے که بگزرد در نظرم | در هیئاتِ او خیره بماند بصرم
چون من نتوانم که جوان گردم باز | آخر کم از آنکه در جوانان نگرم

سختیِ صدمهٔ فراق

خود را بمقام شیر میدانستم | چون خصم آمد به روبہے سانستم
گفتم، من و صبر، اگر بود روزِ فراق | چون واقعه اوفتاد نتوانستم

تاسّف بر عمرِ گزشته

شبهاز همه خلق نهاں مے گریم | چشم از غمِ دل بر آسماں مے گریم
طفل از غمِ مرغِ رفته چون گریه کند | بر عمرِ گزشته هم چناں مے گریم

امتناعَ از خورد گیری

چون ما و شما اقارب یکدگریم | به زاں نبود که پردهٔ هم ندریم
اے خواجه تو عیبِ من مکن تا من نیز | عیبِ تو نگویم که یک از یک بتریم

خواهشِ جنگ بامیدِ معانقهٔ صلح

گر بررگِ جان زشتت آید تیرم | چه‌خوشتر ازانکه پیش‌دستت‌میرم
دل با تو خصومت آرزو میکندم | تا صلح کنی و در کنارت گیرم

حضورِ دوست در همه حال

می آئی و لطف و کرمت می بینم | و آسائشِ جان در قدمت می بینم
و آن وقت که غائبی همت می بینم | هر جا که نگه می کنمت می بینم

تحاشی از توبه

گفتم که دگرچشم به دلبر نه کنم | صوفی‌شوم وگوش‌به منکر نه کنم
دیدم که‌خلافِ طبع‌موزونِ من‌ست | توبت کردم که‌توبه دیگر نه کنم

دشواریِ مواصلت

مه را زفلک بطرفِ بام آوردن | و ز روم کلیسا بشام آوردن
در وقتِ سحر نمازِ شام آوردن | بتوان ، نتوان ترا بدام آوردن

دلیلِ عدمِ وصول الی‌الله

نه سروتوان گفت نه‌خورشیدو نه‌ماه | آه از تو که در وصف نمی آئی آه
هر کس‌به رهے میرود اندر طلبت | گر ره بتوبودے نه‌بُدے این همه‌راه

سیر نشدن از دوست

اےراهروان راگزر ازکوےتو نه | ما بے خبرازعشق‌وگزرسوےتونه
هرتشنه که ازدستِ تو بستاند آب | ازدستِ تو سیرگردد ازروےتونه

فراموش نکردن در غیبت

اے یار کجائی که در آغوش نهٔ | وامشب بر ما نشسته‌چون‌دوش نهٔ
اے سروِ بلندوراحتِ جسم‌و روان | هر چند که غائبی فراموش نهٔ

شکایت از دیده و دل

اے کاج نه کردے نگاه از دیده | بر دل نه زدے عشق تو راه از دیده
تقصیر ز دل بود و گناه از دیده | آه از دل و صد هزار آه از دیده

طلب عنایت از دوست

روزے دوسه شد که بنده نمواختهٔ | و اندیشه بذکر ما نه پرداختهٔ
زاں مے ترسم که دشمناں اندیشند | کز چشم عنایتم بینداختهٔ

دشواری ترک نظر

گفتم که کنم توبه ز صاحب نظری | باشد که بلاے عشق گردد سپری
چنداں که نگه مے کنم اے رشک پری | بار دومیں ز اولیں خوب تری

در بلاے عظیم از اندک ضرر ترسیدن

گویند که دوش شحنگاں تتری | دزدے بگرفتند بصد حیله گری
امروز به آویختنش مے بردند | میگفت رها کن که گریباں بدری

عشق فطری

گیرم که به فتواے خردمندی وراے | از دائرهٔ شرع بروں ننهم پاے
با میل که طبع میکند چه تواں کرد | عیبے ست که در من آفریده ست خداے

مفردات

فرزندان نا خلف

دانی چه گفته اند بنی عوف در عرب * نسل بریده به که سوالید بے ادب

ترک ماسوا

تو آتش به نے درزن و درگزر * که نه خشک در بیشه ماند نه تر

زور آزمائی بر ضعفا

مرّوت نباشد بر افتاده زور * بُرد مرغ دون دانه از پیش مور

موافقت روزگار

خواهی که به طبعت همه کس دارد دوست
با هر که در اوفتی چنان باش که او ست

معنی هدایت و ضلالت

گر راه نمائی همه عالم راه ست * ور دست نگیری همه عالم چاه ست

حوادث ناگهانی

نهالے که سی سال گردد درخت * ز بیخش بر آرد یکے باد سخت

صحبت نا جنس

اگر نوّاب و سرهنگان هم از درگه برانندت
ازان بهتر که در پهلوے مجهولے نشانندت

موافقت وقت

سلطان چو بمنزل گدایان آید * گر بر سر بوریا نشیند شاید

شان ضعفا

گر ز هفت آسمان گزند آید * همه بر عضو دردمند آید

فرق در مشقّت و مصیبت

اگر دندان نباشد نان توان خورد * مصیبت آن بود کت نان نباشد

خاصّهٔ گدایان

منعم که نظر بحال درویش کند * چندان که کرم کند طمع بیش کند

اعتدال در تواضع

تواضع گر چه محمود ست و فضل بیکراں دارد
نشاید کرد بیش از حد که هیبت را زیاں دارد

دو گونه یاس بعد از امید

گفتم که بر آید آبے از چاهِ امید * افسوس که دلو نیز در چاه افتاد

مسافر نوازی

بشکر آنکه تودرخانۀو اهلت پیش * نظر دریغ مدار از مسافرِ درویش

فرق در عاقل و نادان

کوته نظراں رانبود جزغمِ خویش * صاحب نظراں راغم بیگانه وخویش

تحمّل

گر بلندت کسے دهد دشنام * به که ساکن دهی جوابِ سلام

ناصحِ تجربه کار

بشنو که من نصیحتِ پیراں شنوده ام
بیش از تو خلق دیدۀ و پیش از تو بوده ام

دلداری برائے دل آزاری

از بہر دل کسے بدست آوردن * مطبوع نباشد دگرے آزردن

جزائے بد

چو بد بگفتی مباش ایمن زبد گو * که بد را کس نخواهد گفت نیکو

عالم مفلس

صاحب دل و نیک سیرت و علّامه * گو کفش دریده باش و خلقان جامه

اعتدال در سخا

کرم بجائے فرو ماندگان چو بتوانی * مروتست نه چندانکه خود فرومانی

تفسیرِ مردانگی

مردی نه بقوّت ست و شمشیر زنی * آنست که ظلمے که توانی نه کنی

استحکامِ دوستی

تو با ما روز و شب در باغ آنسی * خلافست اینکه طول العهد یُنسی

هدیۂ ضعفاء

پائے ملخے نزدِ سلیماں بردن * عیبست ولیکن هنرست از مورے

نصیحت نا شنودن

من سخن راست نوشتم تو اگر راست نخوانی
جرم کلجلاج نباشد چو تو شطرنج ندانی

ختمِ کلام

کتبت لیبقی الذکر فی اسم بعدی * فیاذا الجلال اغفر لکاتبه السعدی

مطائبات و ہزلیات و مضحکات

شیخ کے کلّیات کا سب سے اخیر حصّہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحے سے زیادہ نہ ہوگا ۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارضِ کمال پر ایک نہایت بدنما مسّہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے ۔ اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اس حصّے میں اپنی شیخوخت اور تقدّس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بے باکی سے دل کھول کر فحش و ہزل کی داد دی ہے ، جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائجِ افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں ۔ آدمی کا خطا وار اور ناقص ہونا یہی اس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور ان کا ہمیشہ ایک ضابطے اور قانون کے سوافق سرزد نہ ہونا ، یہی وہ چیز ہے جو اس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے ۔ انسان کے خیالات کو ایک نادان بچے کی حرکتوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ، جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصّہ آتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا اور جب یہ صفت حد سے گزر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے مگر شیخ نے اس مجموعے کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں جو قابل لحاظ ہیں ۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

اَلْزَمَنِی بَعْضُ اَبْنَاءِ الْمُلُوکِ اَنْ اُصَنِّفَ لَهُ کِتَابًا فِی الْهَزْلِ عَلٰی طَرِیْقِ السُّوْزَنِیِّ فَلَمْ اُجِبْهُ فَهَدَّدَنِی بِالْقَتْلِ فَلِاَجْلِ ذَالِکَ اَجَبْتُ اَمْرَهُ وَ اَنْشَدْتُ هٰذِهِ الْاَبْیَاتَ وَ اَنَا اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِیْمَ

یعنی - ایک بادشاہزادے نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اس کے لیے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں۔ میں نے نہ مانا ، اس پر اس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی ، اس لیے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے اور میں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں -

شیخ کا یہ عذر جہاں تک کہ ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ، ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا - تاتار سے لے کر روم و مصر و حبش تک اس کی جولان گہ تھی - اس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ اس کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ گیا تھا - مسلمان امیر زادوں اور بادشاہزادوں کی صحبتوں میں لہو و لعب اور تمسخر و استہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی - پس اگر کسی نالائق بادشاہزادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سن کر اس خیال سے کہ ہمیشہ گرمئی صحبت کے لیے ایک مجموعۂ ہزل و فحش موجود رہے ، شیخ کو ان ہفوات کے لکھنے پر مجبور کیا ہو تو کچھ تعجّب کی بات نہیں ہے اور چونکہ اس مجموعے میں صریح فحش اور علانیہ پھکڑ کے سوا بامزہ اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصیّت ہے ، بہت کم پائے جاتے ہیں ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اپچ اور طبیعت کی امنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت و کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں -

ایران میں ہزل و فحش کی شاعری دورۂ غزنویّہ کے شعراء

سے برابر چلی آتی تھی اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعراء کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا ۔ اکثر ہاجی اور ہزّال حکیم کے لقب سے ملقّب ہوتے تھے اور اب تک ہوتے ہیں ۔ جیسے حکیم انوری ، حکیم خاقانی ، حکیم شفائی ، حکیم قاآنی وغیرہ وغیرہ ۔ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے ، حکیم سوزنی کہلاتا تھا ۔ اس کا ہزل اور فحش انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا ۔ اس نے حکیم سنائی کی بہت سی ہجویں لکھی ہیں اور حکیم صاحب نے بھی با این ہمہ مشیخت و تقدّس اس سے تنگ آ کر اس کے جواب میں ایک ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابوالعلائی گنجوی جو منو چہر شروانشاہ کے عہد میں پائے تخت کا ملک الشعراء تھا ، باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مربّی اور خسر تھا ، اسکے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق ہجوبازی ہوتی تھی جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو برائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے اس سے بالکل پاک اور مبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جا سکتا جس کا کہ وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے ۔

ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنفوان شباب میں جو کہ شوخی اور بیباکی کا زمانہ ہے کسی موقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہوگی اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے ، مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع کرنا نہیں چاہتا ۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا مگر چونکہ وہ زمرۂ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا

اور معتقدین کے نزدیک اس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا اس لیے کسی بزرگوار نے اس کی وفات کے بعد اس ناشدنی مجموعے کو بھی تبرّکاً و تیمّناً کلیات میں داخل کر دیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصّہ گلستان کے مرّتب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا کیوں کہ اس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے ، شیخ نے گلستان میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں ۔

ہم کو بہت تجسّس سے چند رباعیاں اور قطعے اس مجموعے میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔

رباعیات

انجامِ حسنِ نوخطاں

آن عہد بیاد داری و دولت و داد — کز عاشقِ بیچارہ نمی کردی یاد
آنکہ بگریختی کہ کس چون تو نہ بود — وامروز بیامدی کہ کس چون تو مباد

ایضاً

آن ماہ کہ گفتی ملکِ رحمانست — این بار اگرش نگہ کنی شیطانست
روئے کہ چو آتش بہ زمستان خوش بود — امروز چو پوستین بہ تابستان ست

قطعات

تقویٰ بضرورت

چو خویشتن نتواند کہ مے خورد قاضی
ضرورتست کہ بر دیگران بگیرد سخت

که گفت پیره زن از میوه میکند پرهیز
دروغ گفت که دستش نمے رسد به درخت

تاسف در بلائے عظیم برفوتِ اندک

مرد کے غرقه بود در جیحون کز سمرقند بود پنداارم
بانگ مے کرد و زار مے نالید کاے دریغا کلاه و دستارم

توبۂ ضعفِ پیری

حریف عمر بسر برده در فسق و فجور
وقتِ مرگ پشیماں همی خورد سوگند
که توبه کردم و دیگر گنه نخواهم کرد
تو خود دگر نتوانی بریشِ خویش مخند

عربی قصائد اور مقطعات

کلیّات شیخ میں بیس صفحے کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور ان کے سوا اس کے ملمّعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں ۔ گلستان میں بھی جیسا کہ اس نے خاتمے میں تصریح کی ہے، تقریباً تمام عربی اشعار اسی کے ہیں ۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیار عرب میں بسر ہوا تھا اور عربی زبان بمنزلۂ مادری زبان کے ہو گئی تھی ، اس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد اس نے زیادہ تر اپنی توجّہ دینیات اور تصوّف اور علم ادب میں مصروف کی تھی ۔ گو اس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے ، مگر جس قدر ہے ، وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشّاق اور ماہر ادیب کا ہونا چاہیے ۔ با ایں ہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا ادّعا نہیں کرتا ۔ چنانچہ بغداد کے مرثیے میں لکھتا ہے :-

وَ بِالشُّعَرَاءِ اَیْمُ اللهِ لَسْتُ بِمُدَّعٍ وَ لَوْ کَانَ عِنْدِی مَا بِبَابِلَ مِنْ سِحْرِ	بخدا کہ میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا ، اگرچہ میرے کلام میں وہ جادو موجود ہے جو بابل میں تھا۔
هُنَالِکَ نَقَّادُوْنَ عِلْماً وَ خُبْرَةً وَ مُنْتَخِبُوا الْقَوْلِ الْجَمِیْلِ مِنَ الْهُجْرِ	یہاں علم اور واقفیت کی رو سے پرکھنے والے اور عمدہ کلام کو برے کلام میں سے چھانٹنے والے موجود ہیں ۔

جَرَتْ عَبَرَاتِی فَوْقَ خَدِّی کَاٰبَةً
فَاَنْشَأتُ هٰذا فِی قَضِیَّةِ مَا یَجْرِی

سوزِ دل کے سبب میرے آنسو چہرے پر ٹپک پڑے ، سو میں نے یہ قصیدہ اس سرگزشت کے بیان میں لکھ لیا۔

وَ لَو سَبَقَتْنِی سَادَةٌ جَلَّ قَدْرُ هُمْ
لَمَا حَسُنَتْ مِنِّی مُجَاوَزَةُ الْقَدْرِ

اگر ذی رتبہ لوگ اس مضمون میں مجھ سے سبقت کرتے، تو البتہ مجھ کو اپنے رتبے سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا ۔

بہر حال اس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے اور اس سے شیخ کی شاعری کا رتبہ سوایا بلکہ ڈیوڑھا ہو گیا ہے ۔ اب ہم اس کے ایک طولانی قصیدے میں سے جو کہ اس نے خرابیٔ بغداد پر لکھا ہے ، کچھ اشعار بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں :-

حَبَسْتُ بِجَفْنَیَّ الْمَدَامِعَ لَا تَجْرِی
فَلَمَّا طَغَی الْمَآءُ اسْتَطَالَ عَلَی السَّکْرِ

میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکا تھا کہ بہنے نہ پائیں، پر جب پانی نے طغیانی کی تو اس بند کو توڑ ڈالا !

نَسِیْمُ صَبَا بَغْدَادَ بَعْدَ خَرَابِهَا
تَمَنَّیْتُ لَوْ کَانَتْ تَمُرُّ عَلَی قَبْرِی

کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اس کی ہوا کا جھونکا میری قبر پر گزرتا ۔

لِاَنَّ هَلَاکَ النَّفْسِ عِنْدَ اُولِی النُّهٰی
اَحَبُّ لَهُمْ مِنْ عَیْشِ مُنْقَبِضِ الصَّدْرِ

کیوں کہ عقل مندوں کے نزدیک مر جانا تنگ دل جینے سے بہتر ہے ۔

۸

زَجَرْتُ طَبِيْباً جَسّ نَبْضِی مُدَاوِياً
اِلَيْکَ فَمَا شَکْوَایَ مِنْ مَرَضٍ يَبْرِی

میں نے طبیب کو جبکہ اس نے علاج کے لیے میری نبض کو چھوا ، جھڑک دیا کہ جا اپنا کام کر ، مجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے۔

۹

لَزِمْتُ اصْطِبَاراً حَيْثُ كُنْتُ مُفَارِقاً
وَ هٰذَا فِرَاقٌ لَا يُعَالَجُ بِالصَّبْرِ

میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر اختیار کیا ہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جسکا علاج صبر سے ممکن نہیں۔

۱۰

وَ لَا تَسْأَلَنْ عَمَّا جَرىٰ يَوْمَ حَصْرِهِمْ
وَ ذَالِکَ مِمَّا لَيْسَ يَدْخُلُ فِي الْحَصْرِ

نہ پوچھو جو حال بنیعباس کی قید کے دن گزرا ، یہ وہ حال ہے جو قیدِ بیان میں نہیں آ سکتا ۔

۱۱

اُدِيْرَتْ كُؤُوسُ الْمَوتِ حَتّٰی كَاَنَّهٗ
رُؤُوسُ الْاُسَارىٰ تَرْجَحِنَّ مِنَ السُّكْرِ

شرابِ مرگ کے جام گردش میں لائے گئے یہاں تک کہ قیدی کُشتوں کے سر (تڑپتے ہوئے) ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جنبش کر رہے ہیں ۔

۱۲

بَكَتْ جُدُرُ الْمُسْتَنْصِرِيَّةِ نُدْبَةً
عَلَى الْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِيْنَ ذَوِی الْحِجْرِ

علماءٔ راسخین پر جو کہ اصحاب عقل و دانش تھے مدرسۂ مستنصریہ کی دیواریں زار زار رو رہی ہیں۔

۱۳

مَحَا بِرُ تَبْكِي بَعْدَهُمْ بِسَوَادِهَا
وَ بَعْضُ قُلُوبِ النَّاسِ اَحْلَكُ مِنْ حِبْرٍ

ان کے بعد دواتیں اپنی سیاھی کے آنسوؤں سے روتی ہیں مگر بعض لوگوں کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں ۔

۱۴

نَوَائِبُ دَهْرٍ لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَهَا
وَ لَمْ اَرَ عُدْوَانَ السَّفِيهِ عَلَى الْحَبْرِ

یہ زمانے کے سخت حادثے ہیں ۔ کاش میں ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانشمندوں پر نہ دیکھتا ۔

۱۵

وَقَفْتُ بِعَبَّادَانَ اَرْقُبُ دِجْلَةَ
كَمِثْلِ دَمٍ قَانٍ تَسِيلُ اِلَى الْبَحْرِ

میں نے شہر عبادان میں ٹھہر کر دجلہ کے پانی کو دیکھا کہ نکتر خون کی مانند سمندر کی طرف بہتا تھا ۔

۱۶

وَ فَائِضُ دَمْعِي فِي مُصِيبَةِ وَاسِطٍ
يَزِيدُ عَلَى مَدِّ الْبُحَيْرَةِ وَ الْجَزْرِ

میرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں جاری ہیں ، خلیج فارس کے مدّوجزر کو اور بڑھا دیتے ہیں ۔

۱۷

وَ هَبْ اَنَّ دَارَ الْمُلْكِ تَرْجِعُ عَامِرًا
وَ يُغْسَلُ وَجْهُ الْعَارِ فِيْنَ عَنِ الْعَفْرِ

یہ نہ سمجھو کہ اب دارالخلافہ پھر آباد ہوگا ' اور علماء کے چہرے غبار ذلت سے پاک کیے جائینگے ۔

۱۸

فَاَيْنَ بَنُو الْعَبَّاسِ مُفْتَخَرُ الْوَرَى
ذَوُوا الْخُلْقِ الْمَرْضِيِّ وَالْغُرَرِ الزُّهْرِ

کہاں ہیں بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا ، جن کے اخلاق بزگریدہ اور پیشانیاں نورانی تھیں ۔

٢٩

غَدَا سَمَرًا بَيْنَ الْأَنَامِ حَدِيثُهُمْ
وَذَا سَمَرٌ يُدْمِي الْمَسَامِعَ كَالسُّمْرِ

ان کا ذکر اب دنیا میں ایک افسانہ ہوگیا اور یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے۔

٣٠

وَفِي الْخَبَرِ الْمَرْوِيِّ دِينُ مُحَمَّدٍ
يَعُودُ غَرِيبًا مِثْلَ مُبْتَدَءِ الْأَمْرِ

حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب ہونے والا ہے جیسا کہ ابتدائے حال میں وہ غریب تھا۔

٣١

أَأَغْرَبُ مِنْ هٰذَا يَعُودُ كَمَا بَدَا
وَسُبِّيَ دَارُ السِّلْمِ فِي بَدْءِ الْكُفْرِ

کیا وہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا ہے کہ تمام دارالاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہوگیا؟

٣٢

أَتُذْكَرُ فِي أَعْلَى الْمَنَابِرِ خُطْبَةٌ
وَمُسْتَعْصِمٌ بِاللّٰهِ لَمْ يَكُ فِي الذِّكْرِ

کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائیگا اور مستعصم باللہ کا اس میں ذکر نہ ہوگا؟

٣٣

ضَفَادِعُ حَوْلَ الْمَاءِ تَلْعَبُ فَرْحَةً
أَصَبْرٌ عَلىٰ هٰذَا وَيُونُسُ فِي الْقَعْرِ

کیا اس پر صبر ہوسکتا ہے کہ مینڈک پانی کے ادھر ادھر خوشی سے کھیلتے پھریں اور یونس[۴] پانی کی تہ میں ہو؟

٣٤

تَحِيَّةُ مُشْتَاقٍ وَأَلْفُ تَرَحُّمٍ
عَلَى الشُّهَدَاءِ الطَّاهِرِينَ مِنَ الْوِزْرِ

مشتاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں ان شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے۔

هَنِيْئاً لَهُمْ كَأْسُ الْمَنِيَّةِ مُتْرَعاً
وَمَا فِيْهِ عِنْدَ اللهِ مِنْ عِظَمِ الْأَجْرِ

موت کا لبالب پیالہ اور جو کچھ کہ اس میں خدا کی طرف سے اجر عظیم ہے ان کو گوارا ہو جیو!

عَلَيْهِمْ سَلَامُ اللهِ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ
بِمَقْتَلِ زَوْرَاءَ اِلٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ

ہمیشہ ان پر شام سے صبح تک زوراء کی قتل گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو!

وَلَيْتَ صِمَاخِيْ صُمَّ قَبْلَ اسْتِمَاعِهٖ
بِهَتْكِ اَسَاتِيْرِ الْمَحَارِمِ فِي الْأَسْرِ

کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے پردہ ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے کان بہرے ہو جاتے۔

كَاَنَّ صَبَاحَ الْأَسْرِ يَوْمُ قِيَامَةٍ
عَلٰى اُمَمٍ شُعْثٍ تُسَاقُ اِلَى الْحَشْرِ

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا کہ آستیں سر میں خاک ڈالے ہوئے میدان حشر کی طرف ہنکاتی جاتی تھیں

وَمُسْتَصْرِخٍ يَا لَلْمُرُوَّةِ فَانْصُرُوْا
وَمَنْ يَصْرِخِ الْعُصْفُوْرَ بَيْنَ يَدَيْ صَقْرٍ

بہت سی فریاد کرتے تھے کہ دہائی ہے مروت کی، کوئی مدد کرو، مگر باز کے پنجے میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے۔

يُسَاقُوْنَ سَوْقَ الْمَعْزِ فِيْ كَبِدِ الْفَلَا
عَزَائِزُ قَوْمٍ لَا يَعُوْدُوْنَ بِالزَّجْرِ

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کے عادی نہ تھے ان کے حرم محترم صحرا میں بکریوں کی طرح ہنکائے جاتے تھے۔

جُلِبْنَ سَبَايَا سَافِرَاتٍ وُجُوهُهَا
كَوَاعِبُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ حُلَلِ الْخِدْرِ

جو لڑکیاں پردے میں چادروں سے چہرے باهر نه نکالتی تهیں ان کو کهلے منه اسیر کر کے لے گئے -

تَقُومُ وَ تَخْفُو فِي الْمَعَاجِرِ وَالْمُلَا
وَ هَلْ يَخْتَفِي مَشْيُ النَّوَاعِمِ فِي الْوَعْرِ

وه کهڑی هوتی هیں اور چادروں اور ٹیلوں کی ڈهلانوں میں منه چهپاتی هیں، مگر ان کٹهن رستوں میں نازنینوں کی چال کب چهپ سکتی هے-

لَقَدْ كَانَ فِكْرِي قَبْلَ ذَالِكَ مَاتَرَى
فَأَحْدَثَ أَمْرٌ لَا يُحِيطُ بِهِ فِكْرِي

اس سے پہلے میری فکر جیسی تهی تو جانتا هے مگر ایسا امر عظیم حادث هوا جو میرے فکر کے احاطے سے باهر هے -

وَ بَيْنَ يَدَيْ صَرْفِ الزَّمَانِ وَ حُكْمِهِ
مُغَلَّلَةٌ أَيْدِي الْقَيَاصِرِ وَ الْحَبْرِ

زمانے کی گردش اور حکومت کے سامنے شہنشاهوں اور داناؤں کے هاته بندهے هوئے هیں -

نَعُوذُ بِعَفْوِ اللهِ مِنْ نَارِ فِتْنَةٍ
تَأَجَّجَ مِنْ قُطْرِ الْبِلَادِ اِلَى الْقُطْرِ

خدا کی پناه هے فتنے کی اس آگ سے جو دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب تک بهڑکتی چلی گئی -

بَدَا وَ تَعَالَى مِنْ خُرَاسَانَ قَسْطَلٌ
فَعَادَ رُكَامًا لَا يَزُولُ عَنِ الْبَدْرِ

خراسان سے ایک غبار نمودار هو کر بلند هوا اور ایک گهنگور گهٹا بن گئی جو چاند پر سے هٹنے والی نه تهی-

۳۷

رَعَى اللّٰهُ اِنْسَانًا تَيَقَّظَ بَعْدَهُمْ
لِاَنَّ مُصَابَ الزَّيْدِ مَزْجَرَةُ الْعَمْرِو

خدا حمایت کرے اس شخص کی جو دولت بنی عباس کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوگیا، کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے ۔

۳۸

وَسَائِرُ مُلْكٍ يَقْتَفِيْهِ زَوَالُهُ
سِوَى مَلَكُوْتِ الْقَائِمِ الصَّمَدِ الْوَتْرِ

خدائے بے نیاز و یگانہ کے ملک کے سوا ہر ملک اور سلطنت کے پیچھے اس کا زوال لگا ہوا ہے ۔

۳۹

اِذَا كَانَ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا فَرْقَ بَيْنَنَا
فَلَا تَنْظُرَنَّ النَّاسَ بِالنَّظَرِ الشَّزْرِ

جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں کچھ فرق نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبّر کی نگاہ سے مت دیکھ ۔

۴۰

وَجَارِيَةُ الدُّنْيَا نَعُوْمَةُ كَفِّهَا
مُحَسَّنَةٌ لٰكِنَّهَا الْكَلْبُ ذُوالظُّفْرِ

کتے کی طرح معشوقۂ دنیا کی ہتیلیاں تو نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے ناخن تیز ہیں ۔

۴۱

وَلَوْ اَنَّ ذَا مَالٍ مِنَ الْمَوْتِ خَالِيًا
لَكَانَ جَدِيْرًا بِالتَّعَاظُمِ وَالْكِبْرِ

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا تو البتّہ بڑائی اور تکبّر کرنے کا مستحق تھا ۔

۴۲

رَبِحْتَ الْهُدٰى اِنْ كُنْتَ عَامِلَ صَالِحٍ
وَاِنْ لَمْ تَكُنْ وَالْعَصْرِ اِنَّكَ لَفِيْ خُسْرٍ

اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا نفع اٹھا لیا، ورنہ کچھ شک نہیں کہ تو ٹوٹے میں رہا ۔

عَلَى الْمَرْءِ عَارٌ كَثْرَةُ الْمَالِ بَعْدَهُ
وَاِنَّکَ يَا مَغْرُوْرُ تَجْمَعُ لِلْمُفْتَخَرِ

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا آدمی کے لیے ننگ کی بات ہے ، مگر اے غافل تو الٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا ہے ۔

عَفَى اللهُ عَنَّا مَا مَضَى مِنْ جَرِيْمَةٍ
وَمَنَّ عَلَيْنَا بِالْجَمِيْلِ مِنَ السَّتْرِ

خدا تعالیٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر ہم پر احسان کرے ۔

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اسکی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا ۔ اس کے قوی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی ۔

اس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتّفاق ہوتا تھا ۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس کشی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجے کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں ، اس نے بھی بیت المقدّس اور اس کے گرد و نواح میں ایک مدّت تک سقّائی کی تھی ۔

اس کا مذہب جیسا کہ خود اس کے کلام سے ظاہر ہے تسنُّن معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت گمان تشیّع کا کیا گیا ہے ، اس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعی لکھا ہے۔ ہم اس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دے کر ایک ایسے شخص کوجو مقبولِ فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے ، بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصّب تھا اور یہی اس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے ۔

اس کو اکثر تذکرہ نویسوں نے اہلِ باطن اور صوفیہ میں
سے شمار کیا ہے ۔ اس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا
ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا ۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا
اور واعظ بھی تھا مگر آجکل کے مشائخ اور واعظین کے بر خلاف
ایک نہایت بے تکلف کھلا ڈلا یار باش ہنسوڑ ، ظریف ، ریا اور
نمائش سے دور سیدھا سادا مسلمان تھا ۔ اس کو آج کل کے حضرات
کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور
بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز
نہ آتا تھا ۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق
کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اس نے مثل ظہیر،
رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں
کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا ۔ با ایں ہمہ وہ
امراء اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور ان کی مدح میں قصیدے بھی
لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اس کی کچھ نذر کرتا تھا
وہ لے بھی لیتا تھا ۔ اس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم
ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا ۔ زیادہ تر
اس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی
اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے ۔ امیروں
سے وہ اس لیے بھی زیادہ میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اس
کی سفارش سے جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا
ہے ، غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے ۔ خود داری اور غیرت
اس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی
وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا ، جیسا کہ اسکندریہ کے قحط
میں اس سے ظہور میں آیا ۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی
خدا تعالیٰ نے اس کی سرشت میں ودیعت کی تھی ۔ اس کے نصائح
اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے ، اگر انسانی ہمدردی
کا جوش اس کے دل میں نہ ہوتا ۔ اس نے اپنی زبان اور قلم

کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے
سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا ۔ کوئی شخص کسی
چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں ، ایک
جوہر فطری ، دوسرے زمانے کے ایسے اتفاقات جو اس کے جلا
کے باعث ہوں ۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اسی
کے موافق اس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا
ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا ، جہاں ہونہار بچوں کو
خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے، یتیمی اور بے پدری
اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن
بسا اوقات ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالتیں غیرت مند اور
جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رُشد کا باعث ہوئی ہیں ۔
جس مدرسے میں وہ حسن اتفاق سے تحصیل علم کے لیے پہنچا ،
وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربرآوردہ تھا اور جس
دارالخلافہ میں وہ مدرسہ واقع تھا وہاں کی سوسائٹی اس وقت
تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذب
تھی۔ اس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفاد حاصل نہیں کیا تھا
بلکہ زمانے نے بھی اس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی ۔ اس کی عمر
کا ایک بہت بڑا اور مفید حصہ نہایت کٹھن اور دور دراز سفر
کرنے اور دنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں
بسر ہوا تھا ۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے
متواتر تغیرات ، ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم
دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اس کی
طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی ۔ بیسیوں خاندان اس کی آنکھوں
کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے ۔ ایک بار جیسا کہ گلستاں
میں مذکور ہے شام میں اس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ
وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے
درجے کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش

کے ساتھ اس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے عجیب و غریب تماشے اس کی نظر سے گزر گئے - سلاطین کردیہ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت ، ایشیا ، افریقہ اور یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی ، اسی صدی میں تمام ہوا - سلاجقہ ، قونیہ اور خوارزم شاهیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا، اسی صدی میں ہوئی - پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزرا اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی، اسی صدی میں تاتاریوں[1] کے ھاتھوں سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سواپانچ سو برس بعد اسی صدی میں همیشه کے لیے نیست و نابود ہوئی اور بقول بعض مؤرخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا ۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستان اور بوستان میں ھے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصّاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا ، اسی صدی میں واقع ہوئی، اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا ، دارلملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا ، اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا ، فرقۂ اسمٰعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمران رہا ، ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردوں نے شام میں ھمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا - یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے ، جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت

---

۱ - اس معرکے میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصادالعباد کے دیباچے میں لکھا ھے ، تاتاریوں نے صرف رے اور اس کے نواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے اور خراسان کے چار شہر بلخ ، مرو ، هرات اور نیشا پور بالکل تاراج اور نابود ہو گئے اور ان کے دائیں بائیں اکثر بستیاں قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں -

حاصل کر سکتا ہے ۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اس نے عربی میں لکھا ہے اس میں کہتا ہے :

''رَعَی اللہُ اِنْساَناً تَیَقَّظَ بَعْدَ ھُمْ

لِاَ نَّ مُصَابَ الزَّیْدِ مُزْجَرَۃُ الْعَمرٖ''

یعنی خدا حمایت کرے اس شخص کی جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے ۔ یورپ کے مشہور مصنف ھگملر صاحب کا قول ہے کہ ''میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے، جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز استاد تھے''۔

اس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسّر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسّر آتی ہیں ۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالے[1] میں اس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھی کہ عالمِ سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علما، صلحا، مشائخ اور کاملین سے ضرور ملتا تھا ۔ صاحب نفحات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانشمندوں اور عالموں کو دیکھا تھا ۔ وہ خود بھی بوستان میں کہتا ہے :-

تمتّع ز ہر گوشۂ یافتم　　ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا، مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے لیکن پھر بھی بلاد اسلام میں ایک جمّ غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علما و حکما کا نظر آتا تھا ۔ خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے، جیسے ایران، روم، شام، عراق، عرب اور مصر وغیرہ ۔ وہ اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے ۔ ہمارے تذکروں سے ثابت

---

۱ - یہ رسالہ شیخ کی کلیات میں شامل ہے ۔

ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا ان میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقّق ایسے موجود تھے جو تمام بلاد اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں - جیسے شیخ محی الدّین ابن العربی ، خواجہ نصیر الدّین طوسی ، شیخ صدالدّرین قونوی ، مولانا جلال الدّین رومی ، ابن تیمیّہ حرّانی ، امام یافعی ، شیخ ابو الحسن شاذلی ، شیخ تاج الدّین قسطلانی ، شیخ شہاب الدّین سہروردی ، شیخ ابن فارض ، شیخ اوحدالدّین کرمانی ، قاضی ابن خلکان ، شیخ الاسلام تقی الدّین ابن الصّلاح ، خواجہ علاؤ الدّولہ سمنانی ، خواجہ بہاء الدّین نقشبند ، علامہ قطب الدّین شیرازی ، امام محی الدّین نووی ، قاضی ناصر الدّین بیضاوی ، ابن عساکر فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ - ایسے ایسے سیکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزرے تھے اور ان کے علاوہ جیسا کہ گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے ، وہ ہر فرقے اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا - جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا ، اسی طرح امراء کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا - کبھی وہ ابرار اور احرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش و الواط کے جلسوں کا تماشائی تھا - نہ اس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا، نہ بت خانے میں رہنے سے ننگ تھا - اسی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا اور وہی بت خانۂ سومنات میں ایک مدت تک پجاری رہا - کبھی وہ بصرہ کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا - غرضیکہ اس کی تمام عمر

خصائل انسانی اور نیرنگئ روزگار کے مطالعے میں بسر ہوئی تھی - اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنّفوں نے اس کو گریٹ مورلسٹ کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھچ سکی - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعرائے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہرا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی - جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے ، اس نے ۱۲۰ برس اس قفس عنصری میں بسر کیے ہیں - اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی ضرور ہے مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے ، شاعر جس قدر بڈھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے - اگرچہ شیخوخت کے مرتبے کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے ، کمال کو پہنچتی جاتی ہے - یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ ان کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجہ کی تھی ، مگر ان کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا - جیسا کہ عُرفی شیرازی کی نسبت شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ''غنچۂ استعدادش ناشگفتہ ماند'' ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پروازی ہو ، بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک اور الّھڑ بچھیرا جس کی بھاگ دوڑ اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے اور ایک معمّر سن رسیدہ شاعر، گو اس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو ، اس شائستہ اور سُدھ سدھے گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اٹھاتا - الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خدا تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں -

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے - ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعیہ پر نہ کہ محض اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہییں ، ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی - دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالا پن اور تعجّب پایا جائے ، ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا - تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں ، کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂشاعری سے خارج ہوگا - چوتھے شاعر کے دل میں جبکہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے ، کم و بیش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے ، ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا - یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی - اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن ان کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے ، جیسے خواجہ حافظ شیراز کی غزل ، اس لیے ہم ان کو شیخ کا ہم پلّہ نہیں سمجھتے - شیخ کو اور شعرأ پر اس سبب سے بھی بہت بڑی فوقیت ہے کہ اس کی نظم و نثر دونوں مسلّم الثّبوت ہیں ، یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلّم الثبوت شعرأ گزرے ہیں ان میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو - اگرچہ ہندوستان میں نور الدّین ظہوری کو بھی نظم و نثر کا جامع مانتے ہیں لیکن اہل ایران اس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں - بے شک اس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النّظر میں نہایت دلفریب ہیں ، جیسے :-

"سنبلِ حرفش از آہِ ناشکیباں ، بنفشۂ نقطہاش از خالِ دلفریباں ،

از رشحِ طراوتِ کلمات ، نہرِ سطر مالا مالِ آبِ حیات، خضرِ تشنہ لبِ سیرابی ادا ، مسیحا مردۂ جاں بخشی ھوا ، نکتہ ھاے برجستہ ، غنچہ ھاے سر بستہ ، نثرش نثرہ رفعت ، شعرش شعری مرتبت ، ہر صفحہ چمنے و ہر سطرے نخلے، برگش لفظ دلکش و بارش معنی بے غش ، ہر حرفش فصلے و ہر فرعش اصلے''۔

اسی طرح سہ نثر کے اور بہت سے فقرے الفاظ پرستوں کو نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں :

خوبّ اندوخوش اند و بُو ندارند

بخلاف اس کے شیخ نے گلستاں میں اس سے بہت زیادہ دلاویز و دلکش الفاظ میں حقائق واقعیّہ کو بیان کیا ہے ۔ یہ بات گلستاں کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی مثلاً :-

۱ ۔ در ایّام جوانی چنانکہ افتد دوانی ۔ نظرے داشتم بہ روئے و گزرے داشتم بہ کوئے ۔

۲ ۔ اے برادر حرم در پیش ست و حرامیان از پس ، اگر رفتی بُردی و اگر خفتی مُردی ۔

۳ ۔ آزردنِ دلِ دوستاں جہل ست و کفارۂ یمین سہل ۔

۴ ۔ تو کہ چراغ نہ بینی بہ چراغ چہ بینی ۔

۵ ۔ طریق درویشاں ذکرست و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکّل و تسلیم و تحمّل ۔ ہر کہ بدیں صفتہا موصوف ست، بحقیقت درویش ست، اگرچہ در قباست۔ امّا ہرزہ گردے بے نمازے ، ھوا پرستے ، ھوس بازے کہ روزھا بشب آرد در بند شہوت ، و شبہا روز کند در خواب غفلت، و بخورد ہرچہ در میاں آید، و بگوید ہرچہ بر زباں آید، زندیق ست اگرچہ درعباست ۔

۶ - پدر را عسل بسیارست ، اما پسر گرمی دارست -
۷ - صیاد بے روزی در دجلہ ماہی نگیرد و ماہی بے اجل بر خشکی نمیرد -
۸ - گوئی خوردہ مینا بر خاکش ریختہ و عقد ثریا از تاکش در آویختہ -
۹ - عصارۂ تاکی بقدرتش شہد فائق شدہ و تخم خرمابہ یمن تربیتس نخل باسق گشتہ ''-

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ھی میں نادرالوجود نہیں ھیں بلکہ ہر زبان میں یہی حال ھے - انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقّی انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ھے ، صرف گنتی کے آدمی ایسے ھین جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اھل فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ھے - بعضے ملٹن کو اور بعضے سکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدہ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ھیں - پس شیخ کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ھے کہ ایران میں صرف اسی کی نظم و نثر دونوں ایسی ھیں جن کو تمام اھل زبان نے تسلیم کیا ھے -

شیخ نے بھی تغزّل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعرائے ایران کی طرح امردوں اور سادہ رخوں کے عشق ھی پر رکھی ھے - لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النّظر میں مذ موم اور قبیح معلوم ہوتی ھے ، حقیقت میں ایسی نہیں ھے اور صرف اس بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعراء پر امرد پرستی کا الزام لگانا بے جا ھے - '' فارسی زبان میں اور اس کی پیروی سے اردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ھے کہ شاعر مرد ھو یا عورت ، رند ھو یا صوفی ، خدا کا عاشق ھو یا مخلوق کا ، مرد کا عاشق ھو یا عورت کا ، بلکہ سرے سے عاشق ھو یا نہ ھو ، ہمیشہ غزل ایسے عنوان

سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اسکا معشوق دونوں مرد ہیں ۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت ' دنیا دار ہو یا تارک الدّنیا ' عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی ' مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ' ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اس کا معشوق مرد ہے۔ اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے ۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد اور کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑیگا ۔ حضرت امیر خسرو دھلوی کی فارسی غزلوں سے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رخ لڑکے پر مفتون ہیں اور ان کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطر و بیقرار ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقت واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے ۔ جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنھوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھا ، نہ اس کی صورت دیکھی ، نہ اسکی بو سونگھی' صدھا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں ، اسی طرح ہزاروں پاک باز اور صاحب عفّت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاھد باز بن جاتے ہیں ۔ البتّہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے ' جس کے اصول اور فروع سب تصنّع اور بناوٹ اور ادّعائے محض پر مبنی ہیں ۔ لیکن شیخ سعدی اور مولانا روم اور امیر خسرو اور خواجہ حافظ اور تمام شعرائے متصوّفین اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ یہ

لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرائے میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعیہ بیان کرتے ہیں لا بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شاهد کے مضامین درج ہیں، حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شاہد حقیقی کی شیون وصفات مراد لینی صرف ایک مّلایانہ گھڑت ہے، جس سے سراسر تکلّف اور بناوٹ پائی جاتی ہے، مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوچۂ شاعری سے نابلد ہیں ۔ کنایہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے ۔ چنانچہ مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں: ۔

خوشتر آن باشد کہ سرِّ دلبران　　گفتہ آید در حدیثِ دیگران

شعرائے متصوّفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو ان میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے، باقی نہیں رهتا ۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ "مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیات متصوّفانہ اشعار میں مشہور ہے، ان کے سامنے کسی نے ان کے معاصر شیخ کمال اسمٰعیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا :۔

چشم اگر این ست و ابرو این و ناز و عشوہ این
الوداع اے زهد و تقویٰ الفراق اے عقل و دیں

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضرور ہے جو معنیٔ مجازی کے سوا کوئی اور محمل نہ رکھتا ہو ۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مترادف لفظ ہیں ۔ پس عین سے ذات الٰہی مراد لی جا سکتی ہے اور ابرو حاجب کا مرادف ہے ۔ پس ممکن ہے کہ حاجب سے

صفات الہی جو کہ حاجب ذات ہیں مراد لی جائیں ۔ مولانا نے
اس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی"
خواجہ حافظ کی نسبت اسی کتاب میں لکھا ہے کہ "یہ شخص
لسان الغیب اور ترجمان الاسرار تھا ، اس نے اکثر اسرار غیبی
اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں
کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا " پھر اکابر صوفیہ میں
سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں
دیوان حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے ، لکین حق یہ
ہے کہ تغزّل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی کے
تتّبع سے حاصل کیا ہے ۔

البتّہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں
نے تغزّل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے ۔ عرب کی
شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت اور ہندی
میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں اور یہ
دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں ، مگر مرد کا مرد
عاشق و فریفتہ ہونا اور اس سے وصل کا طالب اور کامجو ہونا اگرچہ
محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے
فطرت انسانی بالکل ابا کرتی ہے ۔ ہمارے نزدیک اس کا سبب
معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح
تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے ۔ اس میں ضمیریں اور افعال اور
صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں ۔ پس
ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعراء اپنے تئیں
عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے
کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے یہ ثابت
نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت
رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق اور معشوق

دونوں مرد ورص کیے جاتے ھیں ۔ میں یہ خیال کرتا ھوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی توجیہ ھے جس کے صحیح ھونے میں کچھ تھوڑا ھی سا شبہ باقی رہ جاتا ھے ۔ اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ھے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اس کے کہ ان کے ھاں عورتوں کا مردوں سے چھپانا مذھبی فرائض میں سے تھا ، غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں ان کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی ۔ خصوصاً مسلمان بادشاھوں میں اس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا ۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی جو ھندوستان میں پندرہ سولہ برس عالم گیر کے ساتھ رھا ، اپنے وقائع سفر میں لکھتا ھے ''ھندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی متنفّس اگرچہ کیسا ھی ذی مرتبہ اور صاحب اعتبار ھو نہیں جانے پاتا تھا ، ورنہ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ھاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا ۔ اور ایران میں سنا گیا ھے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہر یا گاؤں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وھاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے'' شاید اس بیان میں کچھ مبالغہ ھو ، مگر اس سے یہ ضرور ثابت ھوتا ھے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاھوں کی غیرت حد سے بڑھی ھوئی تھی۔ چونکہ شعراء اکثر بادشاھوں کے مدّاح اور مصاحب ھوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے ۔ پس نہایت قوی گمان ھے کہ شعراء نے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر کرنا اور جو جو معاملات عشق کے زمانے میں عاشق اور معشوق کے درمیان واقع ھوتے ھیں ان کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین

کی غیرت اور حمیت کے بر خلاف سمجھا ہو اور اس لیے تمام عشقیہ
مضامین امردوں اور سادہ رخوں پر ڈالے گئے ہوں ۔ سلاطین مغلیہ
میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال
کی تائید کرتا ہے ۔ ایک موقع پر جہانگیر کے رو برو قوال
امیر خسرو کی غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اس کو سن کر بہت
محظوظ ہو رہا تھا ، جب قوال نے یہ شعر گایا :-

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

بادشاہ دفعۃً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا او
اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگ
اور فوراً ملا نقشی مہرکن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کر
تھا بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج ک
دھیما کریں ۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب
میں بھرا پایا ! عرض کیا ، ''حضور خیر باشد''۔ بادشاہ ۔
کہا ''دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے عزتی کا مضمون شعر میں باند
ہے ، بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی
بے عزتی کی بات کہہ سکتا ہے ؟''

ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اسی وقت بادشاہ
غصہ فرو کر دیا ، انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستا
میں نشو و نما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندوستان کے اصول ک
موافق شعر کہتے تھے ۔ یہ شعر بھی انھوں نے اسی طریقے پر ک
ہے ۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات ک
کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیوں کہ اب تک تیری آنکھو
میں نشے کا یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے ۔ یہ سن کر بادشاہ
غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا ۔